پھر چلا مسافر

بھارت کے چار سفر





ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

پھر چلا مسافر

بھارت کے چار سفر

ان جگھوں کو دیکھنے کے لیے جن سے میرا ماضی جڑا ہوا ہے!

(حصہ اوّل)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ



AASIM PUBLICATIONS
LAHORE - PAKISTAN

پھر چلا مسافر:
بھارت کے چار سفر (حصہ اوّل)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

mushtaq.mangat@gmail.com

اہتمام اشاعت : وقار ندیم احمد

اشاعت اول : 2022ء

ایڈیٹنگ : اویس ضیار

ٹائیٹل : مسز سُندس اویس

پرنٹرز : تسکینِ ذوق پرنٹرز، لاہور

PHIR CHALA MUSAFIR
Bharat Ke Char Safar (Part-One)
Dr. Muhammad Mushtaq Ahmad Mangat

Copyright: 2022 - 1st Edition



Published by:
Aasim Publications
296-B, Revenue Employees Cooperative
Housing Society, Lahore - Pakistan.



یہ کتاب ای بک کی شکل میں انٹرنیٹ پر رکھی گئی ہے۔ آپ اسے ڈاؤنلوڈ کر سکتے ہیں اور کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام تر آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ میں تعلیم حاصل کرنے والے ضرورت مند طالبعلموں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کیلئے خرچ کی جاتی ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ویب سائٹ پر موجود ہے۔

https://taawun.org.pk/downloads/, and
www.scribd.com

انتساب

عاصم الٰہی مانگٹ کے نام

1989-2020

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا

آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا

ترتیب مضامین

اظہار تشکر

میں نے جب پہلی مرتبہ چند صفحات لکھے تو جن افراد نے انھیں پڑھ کر حوصلہ افزائی کی اُن میں برادرم اسلم جاوید اور خواجہ عاصم صاحب سرفہرست ہیں۔اس کے بعد جب میں نے مزید لکھا اور اسے فیس بک کے ذریعے دوسروں تک پہنچایا تو میرے کئی دوستوں اور بھائیوں نے نا صرف سراہا بلکہ مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ سلسلہ جاری رکھوں۔ اِس پذیرائی کا مجھے بے حد فائدہ ہوا۔ ان سب افراد کے نام لکھنا تو ممکن نہیں لیکن چند نام بے حد نمایاں ہیں، جن کا ذکر میں ضرور کرنا چاہوں گا۔

راؤ محمد ظفر، امجد نواز وڑائچ، سید وقاص انجم جعفری، سید عامر محمود جعفری، ڈاکٹر اشتیاق گوندل، جمشید علی خان، فدا محمد خاں، محمد جمیل کرد، عبدالحق ہاشمی، آصف جمال، شعیب ہاشمی، ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی، سید احسان اللہ وقاص، محمد عمر بھٹی، فیصل ٹھاکر، راسخ ٹھاکر، آصف علی آصف، قاضی شفقت، حامد ٹھاکر، ڈاکٹر طاہر مشتاق، عمیر ادریس، فیصل راجوانی، عبدالمحسن شاہین، فاروق بھٹی، ڈاکٹر مسعود احمد شاکر، ڈاکٹر عبدالجبار عباسی، حمودالرحمان شاہین اور محترمہ نویدہ صاحبہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ میری رہنمائی بھی کی۔ میں ان سب کا بے حد ممنوں ہوں۔

ڈاکٹر عبداللہ ہاشمی صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ ناکافی ہے۔انھوں نے مکمل مسوّدہ تفصیل سے پڑھا اور اپنی بہت سی قیمتی آراء سے بھی نوازا۔ ان کا اس مسوّدے کو پڑھنا میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے۔اس کتاب کی تیاری میں عزیزم اویس ضیاء کا انتہائی اہم کردار رہا ہے۔انھوں نے میری تحریر کو بہتر بنانے میں بے حد معاونت کی۔اس کے ساتھ ساتھ عزیزم شعیب حسن نے بھی اس کتاب کو حتمی شکل دینے کے لیے دن رات محنت کی۔

ان سب کے ساتھ ساتھ میں آمنہ نسرین مانگٹ اور محمد عمر بھٹی، ڈاکٹر آصف الٰہی مانگٹ، ڈاکٹر میمونہ ارشد، عاصم الٰہی مانگٹ، رمشہ عاصم مانگٹ ،.برادر محمد اشفاق احمد مانگٹ، محمد لطیف مانگٹ، محمد اشرف مانگٹ، اور بالخصوص اپنی اہلیہ محترمہ کا بے حد مشکور و ممنون ہوں جن کے تعاون سے ہی میں یہ کتاب مکمل کر پایا۔

حرفِ آغاز

میں پہلی مرتبہ 1996ء میں ایک ہفتہ کے لیے بھارت گیا، دوسری دفعہ برادر وقاص انجم جعفری صاحب اور اپنے ایک قریبی دوست عمر فاروق شیخ کے ساتھ 1999ء میں جانا ہوا، تیسری بار 2000ء میں وقاص انجم جعفری صاحب کے والد محترم جناب رفیق انجم جعفری صاحب اور ایک دوست ساجد منظور کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے بھارت کا دورہ کیااور آخری مرتبہ 2005ء میں یونیورسٹی آف مینیجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی (یو ایم ٹی)کے طلبہ کے ایک وفد کو لے کر میں اور ڈاکٹر عرفان شیخ صاحب بھارت کے دورے پر گئے۔

مجھے بذریعہ سڑک، لاہور سے دہلی جانے کا بھی موقع ملا۔ دہلی سے بذریعہ ٹرین چنائی , سابقہ مدراس، چنائی سے ممبئ اور ممبئ سے دہلی کے سفر کا بھی خوشگوار اتفاق ہوا۔ میں ایک دفعہ ممبئ سے پونا بھی گیا۔ دہلی کے علاوہ آگرہ، متھرا، چندی گڑھ، سرہند، لدھیانہ، جالندھر، امرتسر، پانی پت، انبالہ اور ریواڑی کے علاوہ بھی بہت سارے شہر دیکھنے کا موقع ملا۔ ان سفروں میں کیا دیکھا، کیا سنااور کن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں، اس سب کی روداد حاضر خدمت ہے۔

اس سفر نامہ کو میں نے چار حصّوں میں تقسیم کیاہے۔ ہر حصّہ میں ایک سفر کی مکمل روداد بیان کی گئی ہے۔ حصہ اول آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پہلے سفر میں میں اکیلا ہی تھااور میرا قیام دہلی میں ہی تھا۔ دہلی کے علاوہ کہیں اور جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دوسرے سفر میں نے وقاص جعفری صاحب اور عمر فاروق شیخ صاحب کے ساتھ کیا۔ یہ ایک طویل سفر تھا۔ اس سفر میں شمالی اور جنوبی بھارت جن میں چنائی ممبئ،پونا اور راجستان کے کچھ حصّے دیکھنے کا موقع ملا۔ میرا تیسرا سفر جناب رفیق انجم جعفری صاحب اور ساجد منظور صاحب کے ساتھ تھا۔ اس سفر میں ہمیں پنجاب بھی جانے کا اتفاق ہوا۔

میری خوش قسمتی کہ مجھے اس دورہ میں اپنے آبائی شہر بھی جانے کا موقع ملا۔ جس کا میں نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ چوتھا اور اب تک کا آخری سفر میں نے یو ایم ٹی کے طلبہ کے ساتھ بذریعہ بس لاہور سے دہلی اور آگرہ تک کا کیا۔ اس دوران دہلی میں موجود مختلف صنعتی اور تعلیمی اداروں کا دورہ کیا تھا۔

اس سفر نامہ کو لکھتے ہوئے جو مقاصد سامنے تھے ان میں سے سب سے اہم یہ بات تھی کہ آپ لوگوں کے سامنے مختلف علاقوں میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات کا ذکر کیا جائے اور بتایا جائے کہ معاشی ومعاشرتی ترقی کے لیے ان لوگوں نے کیا کیا اقدامات کیے۔ اس سے آپ کو مختلف علاقوں کی تاریخ اور اُن میں ہونے والی معاشی و معاشرتی تبدیلیوں کو جاننے کا بھی موقع ملے گا۔

اس کوشش میں میں کہاں تک کامیاب ہوا،اس کا فیصلہ آپ ہی بہتر انداز سے کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی مزید بہتری کے لیے آپ کی آراء کا ہمیشہ منتظر رہوں گا۔اور اگر آپ کوئی بات خلافِ واقعہ پائیں تو ضرور آگاہ کریں، تاکہ اصلاح کی جاسکے۔

محبت واحترام کے ساتھ

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

فروری 2022

296 -B-Revenue Employees Housing Society, Lahore

Pakistan

mushtaq.mangat@gmail.com

پیش لفظ

ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی

اردو سفر نامے کا آغاز یوسف کمبل پوش کے ذوق آوارگی سے ہوا اور "عجائبات فرنگ" کی شکل میں نمودار ہوا تو کئی دیگر مسافروں کو سفر نگاری کی مہمیز ملی۔ یہ سفر جاری رہا لیکن دو تین دہائیوں سے اس میں تیزی آتی ہے اور بیسیوں سفر نامے لکھے گئے۔ان میں ایک بڑی تعداد شوق سفر میں عقیدتوں کے مراکز کی ہے۔ سفر نامے میں ایک تو اندازِ بیاں یا اسلوب کو اہمیت حاصل ہے اور ایک اس زاویہ نگاہ کی انفرادیت کی جو ایک سیاح کے مشاہدات کو دوسروں سے مختلف مناظر دکھاتی ہے۔اگر ایسا نہ ہو تو سفر نامہ محض لفظوں کا انبار یا ویرانہ ہوتا ہے اور کبھی قیام نامہ، طعام نامہ یا سفری اعمال نامہ۔ سفر نامہ نگار جب اینٹ گارے کے مکانات سے مکینوں کی سوچوں کا سراغ لیتا ہے اور کھنڈروں سے تہذیب اور ثقافت کشید کرتا ہے تو اظہار جمال نہ بھی ہو، کمالِ فن نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر محمد مشتاق مانگٹ بنیادی طور پر ایک انجینئر اور کاروباری شخصیت ہیں لیکن انھیں سفر کا لپکا ہے مار کو پولو اور ابنِ بطوطہ کی طرح ان دیکھی زمینوں کی طرف نکل کھڑے ہونا اور سفر کو پیشہ تو نہیں بنایا لیکن کاروباری بہانے سے بے شمار سفر کر چکے ہیں۔ صاحبِ مطالعہ ہیں، تاریخ اور انسانی نفسیات ان کے پسندیدہ مضامین ہیں اور قلمکار بھی ہیں۔آپ کو ان کی تحریروں میں دلچسپی کے بے شمار پہلو نظر آئیں گے۔ ان کی گفتگو میں دھیرج ہوتی ہے اور تحریر میں کشش ۔وہ مناظر کشی سے پہلے منظر کو پردہ ذہن پر نقش کرتے ہیں۔"جب کوئی منظر یا چہرہ مجھے بے حد خوب صورت لگتا ہے تو میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ اس وقت تک اس منظر کے علاوہ مجھے اور کچھ نظر نہ آئے اور میں اسے دیر تک دیکھتا رہوں۔اس طرح یہ منظر یا چہرے کی تصویر میرے دماغ پر نقش ہو جاتی ہے۔ایسے منظر کو دوبارہ دیکھنے کے لیے مجھے کسی تصویر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعد

ازاں میں جب چاہوں آنکھیں بند کر کے اس منظر سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔" اس طرح ذہن پر نقش تصویروں اور مناظر کو تحریر میں لاتے انھیں دقت نہیں ہوتی اور یہ تصویر سے واضح تر تصویر ہوتی ہے۔

زندگی سفر اور سفر زندگی ہے انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں ذات کی بازیافت بھی ہے اور حقائق کی دریافت بھی۔ "پھر چلا مسافر" میں بھارت کے چار اسفار کا ذکر ہے جو مختلف ادوار میں کیے گئے۔ مانگٹ صاحب کا حافظہ اچھا ہے اور ہر سفر کے مشاہدات نوٹ بھی کرتے ہیں چنانچہ بار دیگر سفر کرتے جو نو دریافت پر تقابلی جائزے سے اسے واضح کرتے ہیں۔

بھارت کے سفر ناموں میں زیادہ تر دلی، آگرہ اور علی گڑھ تک کے اسفار کا ذکر ملتا ہے۔ "پھر چلا مسافر" اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس میں جنوبی ہند پہلی دفعہ پورے تناظر میں دکھائی دیتا ہے۔ مانگٹ صاحب صرف سفر کے حالات قلم بند نہیں کرتے بلکہ تہذیبی تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ سفر نامہ تاریخ بھی ہے جغرافیہ بھی اور سماجیات کا مجموعہ بھی لیکن مصنف دیدہ دل وا رکھے اور غیر متعصب رویے سے تجزیہ کرے تو یہ صنف اور زیادہ پر لطف نظر آتی ہے۔ معاشی حقائق، شمال سے جنوب کو جائیں تو شرح خواندگی کا ارتقاء، شمال اور جنوب کے معاشرتی فاصلے۔۔۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ سنگھ صرف سکھ ناموں کا لاحقہ نہیں بلکہ دیگر کئی مذاہب میں بھی سنگھ ہوتے ہیں۔ مجھے یہ بات پہلی دفعہ اس سفر نامے کے مطالعے سے معلوم ہوئی۔

ہر تحریر کے بین السطور ایک پیغام ہوتا ہے اور مصنف اسے عام کرنا چاہتا ہے مگر برملا نہیں کرتا بلکہ بین السطور کہتے ہیں، جس سے بات مؤثر ہو جاتی ہے۔ وہ قارئین کو دنیا میں مالی آسودگی اور عزت و وقار کا درس دیتے ہیں۔ وہ محنت، ہمت اور جدوجہد پر

اُکساتے ہیں۔" قلعے کا کام پناہ دینا ہے۔اس میں کون پناہ لیتا ہے، اس کا انحصار، ہمت مرداں پر ہے۔ یہ عمارت خود تو کسی کو اندر آنے سے نہیں روک سکتی،اس میں تو وہی رہے گا جس میں اندر آنے کی ہمت اور حوصلہ ہے۔"

سفر نامے میں ان دکھوں کی آہٹ بلند نظر آتی ہے جو تقسیم ہند کے وقت ایک نسل نے اٹھائے اور ان کے نفسیاتی اثرات تلے اب اگلی نسل بھی جینے کی خُو کر رہی ہے۔لاکھوں لوگ مذہب و ملّت کے امتیاز سے گاجر مولی کی طرح کٹ گئے۔ خود ان کے خاندان کو اس المیے سے دوچار ہونا پڑااور مصنف نفسیات دان ہے اس لیے اسے اس دکھوں کی گہرائی کا اندازہ ہے۔ یہ زخم انسانوں کی سائیکی بدل گئے اور مدتوں رستے رہے۔ حتیٰ کہ ایک نسل دنیا سے رخصت ہو گئی۔

سفر نامے میں بے شمار افراد سے مکالمے کی داستانیں ہیں، تہذیب و تمدن کی جھلکیاں بھی بار بار نظر آتی ہیں۔ سفر نامہ "پھر چلا مسافر" عام سفر ناموں سے ہٹ کر سادہ سے اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے اور تصنع اور تخیلاتی تصویروں سے پاک ہے۔

بھارت کا پہلا سفر: خوف اور شوق کے ساتھ

بھارت کا ویزا

میرے آباؤ اجداد تقسیم ہند کے وقت مشرقی پنجاب کی ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند سے پاکستان آ کر ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کی تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ ہم ان سے بچپن ہی سے اپنے آبائی وطن کی باتیں سنتے چلے آرہے تھے، جن کی وجہ سے قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ اُس بھارت کو دیکھا جائے جس کا ذکر ہمارے والدین حسرت و یاس سے صبح وشام کرتے رہتے ہیں۔

میں اس خواہش کی تکمیل کی خاطر بھارت جانے کی کوئی نہ کوئی وجہ ڈھونڈتا رہتا تھا۔ مختلف لوگوں سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یا تو وہاں پر آپ کے رشتے دار ہوں تو آپ ان کی دعوت پر بھارت جاسکتے ہیں یا پھر کوئی کاروباری معاملہ ہو تو آپ بھارت جا سکتے ہیں، صرف سیر وسیاحت کے لیے بھارت جانے کا ویزا نہیں ملتا۔

یہ ایک اتفاق ہے کہ بھارت میں ہمارا کوئی بھی رشتہ دار نہیں ہے۔ کچھ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، باقی جو بچے تھے وہ شہید کر دیئے گئے تھے اور کچھ خواتین اغوا ہو گئیں تھیں۔ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے میں نے بھارت میں کچھ لوگوں کے ساتھ کاروباری روابط قائم کیے، ان میں کچھ حضرات ٹیکسٹائل کی مصنوعات بناتے تھے، جنھیں ہم نے درآمد کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر ایک دن ان سے ویزے کے لیے خط کا کہا، جو انھوں نے بھجوا دیا اور میں نے اسلام آباد میں واقع بھارت کے سفارت خانے سے ویزہ حاصل کر لیا۔ یہ 1996ء کی بات ہے، اس وقت ویزا کے بارے میں اتنی سختی نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں سفارت خانے کے اندر گیا، تو براہ راست ایک انڈین آفیسر نے میرا انٹرویو کیا تھا۔ مجھے جو ویزا ملا، وہ بھارت کے تین شہروں کا تھا اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا تھا۔

بھارت: بذریعہ پی آئی اے

ان دنوں بھارت جانے کے لیے سمجھوتہ ایکسپریس نام سے ایک ریل گاڑی کا آغاز ہو چکا تھا، لیکن میں نے بذریعہ ہوائی جہاز بھارت جانے کا فیصلہ کیا۔ بھارت جانے والے پی آئی اے کے جہاز پر سفر، ایک یادگار تجربہ تھا۔ جب میں اپنا بورڈنگ کارڈ لے چکا، تو میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ سول کپڑوں میں موجود تھے، جو مسافر نہیں لگ رہے تھے۔ انھیں غور سے دیکھنے پر محسوس ہوا کہ یہ لوگ ہماری پاک فوج سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس بھی مسافر پر ان کو شک ہوتا، وہ اسے بلاتے اور کئی سوالات کرتے تھے، تسلی ہونے کے بعد جانے کی اجازت دیتے۔ سامان اور جامہ تلاشی بھی بے حد سخت تھی۔ ہم بس پر بیٹھ کر جہاز کی طرف چل پڑے، سکیورٹی کے لوگ بھی بس میں ہمارے ساتھ تھے۔

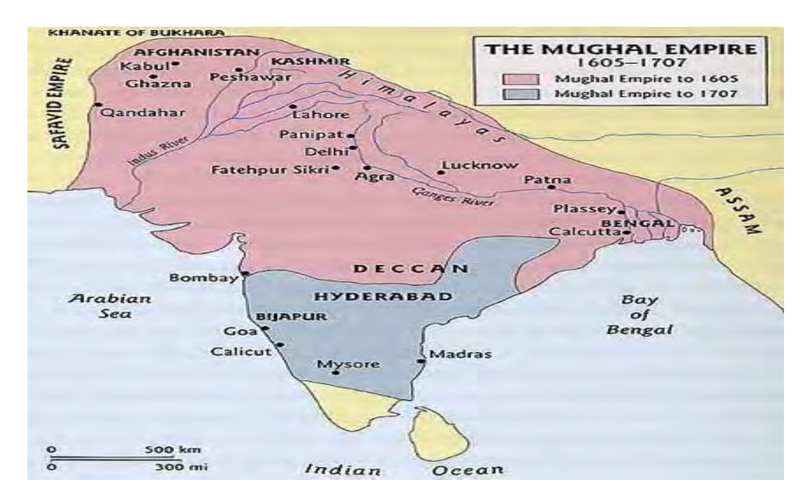
میں نے اب تک جتنے بھی ہوائی سفر کیے ہیں، ان میں یہ پہلا اور آخری مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ مسافروں کی جہاز کے دروازے پر بھی تلاشی لی گئی ہو۔ عام طور پر ایک دفعہ ایئرپورٹ کے اندر جاتے وقت اور دوسری مرتبہ لاؤنج میں جاتے ہوئے تلاشی لی جاتی ہے۔ لیکن بھارت جاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر جہاز کے گیٹ پر بھی ہماری تلاشی ہوئی۔ جو نوجوان تلاشی لے رہا تھا میں نے ان سے ہنس کر کہا کہ سیکورٹی کے بہت سخت انتظامات ہیں، اس نے ہنس کر جواب میں صرف اتنا کہا کہ یہ سب بھارت جانے والی فلائیٹ کی وجہ سے ہے۔ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔

میں جب جہاز کے اندر گیا تو میں نے دیکھا کہ جہاز میں سو کے قریب مسافر تھے، جن میں سکھ حضرات بھی کافی تعداد میں تھے۔ اس بات پر کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا کہ سکھ اتنی تعداد میں بھارت جا رہے ہیں لیکن حیرانی اس وقت ہوئی جب میں نے

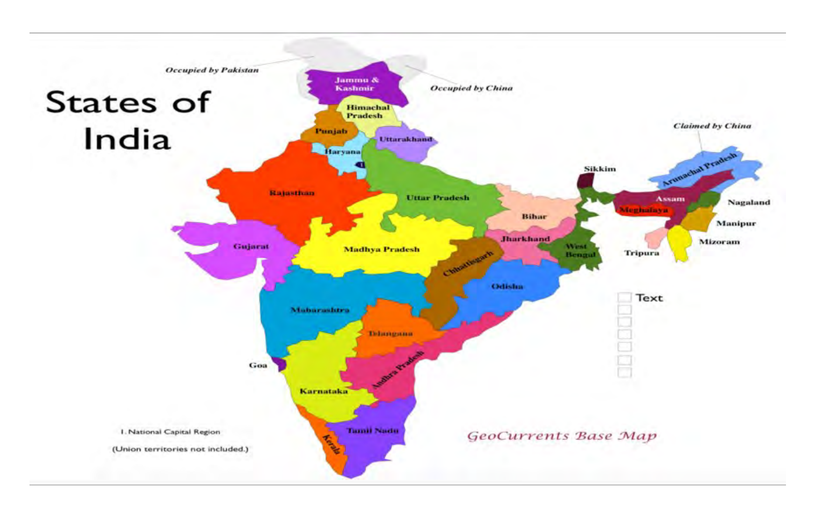
دیکھا کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے پشتو میں بات کر رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ افغانستان سے آئے ہیں اور اب بھارت جا رہے ہیں۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ رنجیت سنگھ کے دور سے ایک بڑی تعداد میں سکھ ،افغانستان میں آباد چلے آرہے ہیں۔ افغانستان میں رہنے کی وجہ سے وہ پشتو بول رہے تھے۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سردار سے اردو میں بات چیت شروع کی، مگر ہم بہت جلد پنجابی میں بات کرنے لگے۔

اس نے مجھے بتایا کہ اس کے آباؤاجداد کئی نسلوں سے کابل میں آباد ہیں۔ ہم لوگ پشتو، فارسی اور دری زبان آسانی سے بولتے ہیں، مگر پنجابی ہم کبھی بھی بھول نہیں پائے اور نہ ہی بھول سکتے ہیں۔ اس نے مزید بتایا کہ ہمارے دھرم کے مطابق ہر سکھ پر لازم ہے کہ اسے پنجابی پڑھنی اور لکھنی آئے اور وہ اپنے گھر میں پنجابی ہی میں بات چیت کرے۔ میں نے اس کی وجہ جاننا چاہی تو اس نے یہ بتایا کیا ہماری مذہبی کتاب ، گورو گرنتھ صاحب پنجابی زبان میں ہے۔ اگر ہم پنجابی بھول گئے تو اپنی مقدس کتاب کو بھول جائیں گے اور ہم ایسا نہیں چاہتے، اس لیے ہر سکھ جتنی بھی زبانیں جاننا چاہے اس پر پابندی نہیں ہے لیکن اس کے لیے پنجابی زبان کا پڑھنا اور لکھنا لازم ہے، ورنہ ہم اسے سکھ نہیں مانتے۔

لاہور سے دہلی کا سفر تقریباً چالیس منٹ کا تھا، جو بہت جلد ختم ہو گیا اور جہاز کے عملے نے اعلان کیا کہ ہم تھوڑی ہی دیر میں دہلی ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔ جس سے ایک خوشی ہوئی کہ آج اپنے آباؤاجداد کے دیس، میرے بڑے اپنے آبائی شہر سرہند کے لیے دیس کا لفظ ہی استعمال کرتے تھے، میں آنے کا موقع مل رہا ہے اور ایک خوف بھی طاری ہوا کہ پورے بھارت میں ایک دو لوگوں کے علاوہ کوئی میرا جاننے والا نہیں تھا۔



Area Under Mughal Empire in 1605 and 1707



https://www.geocurrents.info

بھارت کی سرزمین پر پہلا قدم

میں نے جب بھارت کی زمین پر پہلی مرتبہ اپنا قدم رکھا ،اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی۔ دل میں جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں، میں نے ان سب کو دہرایا۔ مجھے ایک تو خوشی تھی کہ میں بھارت آیا ہوں اور دوسرا خوف تھا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان موجودہ دشمنی نے لوگوں کا آنا جانا کافی حد تک غیر محفوظ بنا دیا ہے اور آپ کے ساتھ بھارت میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات مجھے بہت سارے لوگوں نے بتائی تھی۔ اس لیے میرے دل میں ایک خوف تو موجود تھا لیکن یہ امید بھی تھی کہ اگر میں نے کوئی غیر قانونی کام نہ کیا تم مجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ انھی سوچوں میں گم میں امیگریشن آفیسر کے سامنے چلا گیا۔

امیگریشن آفیسر نے میرے پاسپورٹ کو بہت غور سے دیکھا۔ میری عمر اس وقت 38 سال کے قریب تھی۔ پاسپورٹ دیکھنے کے بعد اس نے مجھ سے کئی سوال کیے جن کا میں نے اسے تسلی بخش جواب دیا۔ کچھ وقت کے بعد اس آفیسر کی تسلی ہوئی اور اس نے مجھے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ یہاں پر بھی ایسے کئی لوگ موجود تھے جن کا تعلق فوجی اداروں سے لگتا تھا۔

میں ایئرپورٹ سے باہر نکلا، اب مسئلہ یہ تھا کہ جو صاحب مجھے لینے آئے ہیں ،ان کو میں کیسے پہچانوں گا؟ عموما ایسے موقع پر لوگ ایک بڑے کاغذ پر مہمان کا نام لکھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن جو صاحب مجھے لینے آئے تھے وہ ایک کمپنی میں سینئر مینیجر تھے، جو ایسا کرنے میں شاید اپنی ہتک سمجھتے ہوں گے، یہ میرا خیال ہے۔ انھوں نے اپنے ذہن میں میری ایک تصویر بنائی ہوئی تھی جو انھوں نے میرے پاسپورٹ پر دیکھی تھی اور کارڈ کا تکلف نہیں کیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک صاحب مجھے بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے

بھی یہی لگا کہ یہ صاحب مجھے لینے آئے ہیں۔ میں نے قریب جا کر ان سے کہا کیا آپ کا نام شرما ہے؟ انھوں نے جواباً کہا کیا آپ کا نام مشتاق جی ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا، خیریت دریافت کی اور چند ہی لمحوں میں ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ان سے ملنے کے بعد بہت حد تک میرا خوف دور ہو گیا۔

اس وقت دہلی ایئر پورٹ بہت زیادہ وسیع نہیں تھا،آپ یوں سمجھ لیں کہ جیسے لاہور کا پرانا ایئر پورٹ ہو۔ میں شرما صاحب کے ساتھ باہر کی طرف چل پڑا۔ میرا خیال تھا کہ ان کی گاڑی پارکنگ میں ہو گی، لیکن انھوں نے بتایا کہ گاڑی پارکنگ میں نہیں بلکہ قریب ہی ایک جگہ کھڑی ہے۔ ہم اُس جگہ پر چلے گئے جہاں ان کی گاڑی کھڑی تھی، وہاں پر ایک گارڈ بھی کھڑا تھا اور نو پارکنگ کا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ شرما صاحب نے یہاں گاڑی کیوں پارک کی ہے؟ لیکن جلد ہی میری حیرانی دور ہو گئی، جب شرما صاحب نے جیب سے چند روپے نکال کر گارڈ کو دیے اور گارڈ نے جواب میں شکریہ کہا۔ بعد میں شرما صاحب نے مجھے بتایا کہ پارکنگ خاصی دور ہےاس لیے ہم اکثر یہاں ہی گاڑی کھڑی کر لیتے ہیں اور گارڈ کو چند روپے دے دیتے ہیں جس سے ہمیں آسانی ہو جاتی ہے۔ یہ سب دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ کہنے کو تو ہم دو الگ الگ ملک ہیں، ایک کا نام پاکستان اور دوسرے کا نام بھارت لیکن ہمارے معاملات ایک ہی جیسے ہیں۔

ہوٹل اور ہوٹل میں خفیہ ایجنسی کے فرد کی آمد

ہم گاڑی میں بیٹھ کر نیو دہلی کی طرف چل پڑے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میرا ہوٹل کس طرف ہے؟ جس پر انھوں نے بتایا کہ نیو دہلی کے پاس قرول باغ، انگلش میں اسے KAROL BAGH لکھتے ہیں جبکہ اردو میں اسے قرول باغ لکھا جاتا ہے، کے

علاقے میں آپ کے لیے ایک ہوٹل میں کمرہ بک کروایا گیا ہے۔اتنی دیر میں ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ عام بول چال میں اس علاقے کو نیو دہلی ہی کہا جاتا، پرانے شہر کو دلی یا اندرون دلی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک عام سا صاف ستھرا ہوٹل تھا، لیکن اس کی خوبی یہ تھی کہ یہ نہایت ہی گنجان علاقے میں موجود تھااور سڑک کے کنارے پر ہونے کی وجہ سے ارد گرد بہت سی چیزوں کو یہاں سے دیکھا جاسکتا تھا۔اس ہوٹل کی ایک اور خوبی یہ بھی تھی اس کے سامنے ایک بڑا باغیچہ تھا جس میں لگے بڑے بڑے درخت بہت ہی پیارے لگ رہے تھے۔ مجھے پہلی نظر میں ہوٹل ان درختوں کی وجہ سے ہی پسند آیا۔ شرما صاحب نے مجھے ہوٹل اتارااور کہا کہ میں کل صبح آپ کو ہوٹل سے لے لوں گااور پرانی دلی میں واقع اپنے دفتر چلیں گے۔

میرے پاس شام کا وقت تھا جسے میں اپنی مرضی سے استعمال کر سکتا تھا۔ میں عام طور پر احتیاط کے نقطۂ نظر سے مغرب کے بعد اکیلے ہوٹل سے نہیں نکلتا لیکن آج مجھے یہ لگ رہا تھا کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ شاید اس وجہ سے تھا کہ مجھے لاہور اور قرول باغ میں کوئی فرق ہی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے ہوٹل انتظامیہ کو اپنا پاسپورٹ دیا اور انھوں نے میرا اندراج کیا۔ ہوٹل مینیجر نے مجھے بتایا کیوں کہ آپ پاکستان سے ہیں اس لیے ہمیں فوری طور پر مقامی تھانہ کو آپ کے آنے کی اطلاع دینا ہوگی۔ اس کے بعد پولیس کے لوگ کسی بھی وقت آ کر آپ سے مل سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ نے کہیں بھی جانا ہو تو ہمیں بتا کر جائیں تاکہ ہم پولیس کو بتا سکیں۔اس کے ساتھ ہی مینجر نے یہ بھی کہا آپ کے لیے بہتر ہے کہ رات دیر تک ہوٹل سے باہر نہ رہیں۔آپ سے کون ملنے آتا ہے، انھیں اس کا بھی ریکارڈ رکھنا ہوگا۔ یہ سب سن کر میری خوشی غارت ہو گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں یہاں پر ہر وقت پولیس کی نظروں میں رہوں گا، اس لیے مجھے ہر کام احتیاط سے کرنا ہوگا تاکہ کسی کو شکایت کا کوئی موقع نہ مل سکے۔

میرا یہ دورہ خالصتاً کاروبار کے لیے تھا اس لیے میں ایک لحاظ سے بہت مطمئن بھی تھا لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں مزید سنبھل کر رہوں۔ عام طور پر پاکستان سے جانے والے لوگوں کو آمد کے فوری بعد مقامی تھانہ میں اطلاع کرنا ہوتی ہے لیکن کچھ لوگوں کے لیے یہ شرط نہیں ہوتی۔ اسے نان رپورٹنگ ویزا کہتے ہیں، میرا ویزا نان رپورٹنگ تھا اسی لیے مجھے تھانے جا کر اطلاع دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ پولیس کسی بھی وقت مجھے ہوٹل میں چیک کر سکتی تھی۔ اس وجہ سے میں نے شام کے وقت باہر جانے سے بھی گریز کیا۔ زیادہ وقت میں نے اپنے کمرے میں ہی گزارا۔

اگلی ہی صبح تقریباً چھ بجے مجھے ہوٹل کے استقبالیہ سے فون پر کہا گیا کہ آپ استقبالیہ پر آئیں۔ مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی لیکن میرے پاس ان کے پاس جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں جب استقبالیہ کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک صاحب جن کی عمر پچاس سال ہوگی، شکل و صورت سے دیہاتی آدمی لگ رہے تھے، استقبالیہ پر تشریف فرما تھے۔ مجھے ہوٹل کے مینجر نے کہا کہ یہ صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ان کا تعلق ایک خفیہ ادارے سے ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ مجھے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ میں آپ کا پاسپورٹ چیک کرنا چاہتا ہوں اور یہ دیکھنا چاہتا ہوں کیا آپ اسی ہوٹل میں رہ رہے ہیں؟ میرا تعلق ایک خفیہ ادارہ سے ہے۔ میں نے ان سے اجازت لی اور اپنے کمرے سے پاسپورٹ لینے چلا گیا۔ میں نے انھیں اپنا پاسپورٹ دکھایا اور اس کے بعد جو صورتحال پیدا ہوئی وہ مجھے اب تک مکمل طور پر یاد ہے جو میرے لیے ایک تفریح کا باعث بھی ہے۔

ان صاحب نے جب میرا پاسپورٹ دیکھا۔ پاسپورٹ پر ویزا جاری کرنے کی تاریخ تقریباً تین ہفتے پرانی تھی۔ ویزا پر یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ ویزا بھارت میں داخل ہونے کے بعد صرف پندرہ دن کے لیے کارآمد ہوگا۔ وہ صاحب کہہ رہے تھے کہ جس دن آپ

کو ویزا جاری ہوا ہے، تب سے اب تک بیس دن ہو گئے ہیں، اس طرح سے آپ کا ویزا ختم ہو گیا ہے اور آپ یہاں غیر قانونی طور پر مقیم ہیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ جناب عالی، اس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ جس دن میں بھارت میں داخل ہوں گا اس دن کے بعد صرف پندرہ دن کے لیے مجھے بھارت میں رہنے کی اجازت ہو گی، میں کل آیا ہوں اس لیے ابھی میرے پاس چودہ دن کا ویزا باقی ہے۔

ان صاحب کا اصرار تھا کہ ویزا جاری ہونے کے بعد آپ صرف پندرہ دن کے لیے رہ سکتے۔ مجھے تھوڑی دیر میں یہ لگنے لگا کہ اگر ان صاحب کو میری بات سمجھ نہ آئی تو میرے لیے خاصی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے اپنے تمام ترجذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اور ان کو بات سمجھانے کی کوشش لیکن ناکام رہا۔ ایسی صورتحال میں ہوٹل مینیجر سے درخواست کی کہ وہ میری اس مسئلہ میں مدد فرمائیں۔ ہوٹل والے بھی ان لوگوں سے خوف کھاتے ہیں اور ان سے بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں لیکن میرے کہنے پر مینجر صاحب نے بات کی اور ان صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ کسی حد تک مطمئن ہوئے لیکن ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مکمل طور پر تو مطمئن نہیں ہوئے لیکن وہ معاملے کو ختم کر رہے ہیں اور انھوں نے مجھے کہا کہ میں آپ کو دوبارہ چیک کرنے کے لیے آؤں گا۔ میں نے کہا آپ جب بھی تشریف لائیں گے میں آپ کو خوش آمدید کہوں گا۔

اس طرح وہ صاحب چلے گئے اور پھر جتنے دن میں ٹھہرا، وہ روزانہ صبح چھ بجے تشریف لاتے۔ ان کے لیے بھی ایسا کرنا مشکل تھا اور میں بھی صبح ملاقات کیلیے تیار بیٹھا ہوتا تھا، جو میرے لیے بھی آسان نہ تھا۔ اس طرح ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں بعد میں ہم گپ شپ بھی لگاتے تھے اور بہت سی باتیں بھی کرتے۔ میں باتیں تو ان کے ساتھ

کرتا تھا لیکن دل سے خوف کبھی بھی دور نہیں ہوا تھا۔ یہ بات مجھے اب تک یاد ہے، جو کہ اکثر میری تفریح کا باعث بنتی ہے۔

ہند، ہندوستان، بھارت، انڈیا

عام طور پر بھارت کے لیے ہند، ہندوستان اور انڈیا کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔اس تحریر کو لکھنے کے لیے مجھے بھی یہ نام استعمال کرنا ہیں۔ میں نے یہ جاننے کے لیے کہ کونسا لفظ مناسب ہے، ادھر ادھر سے کچھ معلومات حاصل کیں جن کا خلاصہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ معلومات آپ کو اس سفر نامہ کو پڑھنے میں مفید ثابت ہوں گیں۔

سانوجیت نے Encyclopedia History World میں ایک مضمون میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے [1]۔ ان کے مطابق انڈیا کا نام دریائے سندھو سے نکلا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے بھارت کے سب سے قریبی ملک ایران نے اسے ہند اور ہندوستان کہا۔ اہلِ یونان نے اسے انڈس کہا۔ عربوں نے بھی ہند ہی کہا۔ ہندوستان صرف فارسی زبان میں کہا گیا۔ سندھو دریائے سندھ کا ایک قدیم نام ہے۔ جس کا تذکرہ ہندوؤں کی تاریخی کتابوں رگ وید میں بھی ملتا ہے۔انگریزوں نے اسے انڈس کی بجائے انڈیا کا نام دیا۔ پانچویں صدی میں لکھی گئی کتابوں میں بھی یہی نام ملتا ہے۔اہلِ یورپ پچھلے پانچ سو سال سے انڈیا کا لفظ ہی استعمال کرتے آرہے ہیں۔

دوسرا معروف نام بھارت ہے۔ اس موضوع پر Catherine Ojha-émentinCl نے ایک مقالہ لکھا ہے جس کا نام ہے [2]

---

[1] https://www.worldhistory.org/article/203/etymology-of-the-name-india/

[2] https://journals.openedition.org/samaj/3717

'India, that is Bharat...:' One Country, Two Names

ان کے مطابق اس خطہ کے کئی نام ہیں جو زیادہ تر سیاسی، مذہبی، سماجی حالات کی وجہ سے تشکیل پائے ہیں۔ بھارت کے آئین میں اس ملک کا نام انڈیا اور بھارت لکھا ہوا ہے۔ اس لیے یہی دو نام سرکاری مانے جاتے ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے اسے برٹش انڈیا کا نام بھی دیا گیا تھا۔ یہ اس علاقے کا نام تھا جو برطانیہ کے قبضہ میں تھا۔ اس سے پہلے مغل اسے ہند یا ہندوستان ہی کہتے تھے۔ ان کے نام کے ساتھ شہنشاہ ہند ہی لکھا جاتا تھا۔ حضرت محمد مصطفٰی ﷺ کی کئی احادیث سے بھی پتا چلتا ہے کہ وہ بھی اسے ہند ہی کہتے تھے۔ ہندوؤں کی تاریخی کتابوں میں اس کے دس سے زائد نام ملتے ہیں۔

اس مقالے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لفظ "بھارت" کو 1950ء میں "ہندوستان" کے متبادل نام کے طور پر لیا گیا تھا اور اسے بھارتی دستور کا حصہ بنایا گیا ہے۔ بھارت، بھارت ورا، بھرت ورشا کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ایک قدیم ہندو بادشاہ کا نام تھا جس نے اس پورے خطہ پر حکمرانی کی۔ کچھ لوگوں کا اس سے اختلاف بھی ہے۔ مہا بھارت کی کہانی اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی یہ علاقہ بھارت بھی کہلاتا تھا۔ بھارت دستور کا سرکاری نام The Constitute of India ہے۔

ایک وسیع خطہ ہونے کی بنا پر اسے برِ صغیر پاک و ہند (Indian Sub Continent) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نام اس پورے خطہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں بھارت کے علاوہ بھی کئی ممالک شامل ہیں۔

اسی طرح بھارت کے ساتھ لگنے والے سمندر کو بحرِ ہند یا انڈین اوشین ہی کہا جاتا ہے۔ انڈین نیشنل کانگرس، آل انڈیا مسلم لیگ، اسباب بغاوتِ ہند، جماعت اسلامی ہند، کیمونسٹ پارٹی انڈیا، ہندی فلمز، ہندوستان ٹائمز وغیرہ وغیرہ، یہ ثابت کرتے ہیں

کہ اس ملک کو زیادہ تر ہند، ہندوستان اور انڈیا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی ایک مثال ہے جس میں بھارت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ پارٹی

1980 ء میں بنائی گئی تھی۔ یہاں ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جب بھارت میں رہنے والی اسی فیصد آبادی کو آٹھ سو سال بعد اپنی مرضی کی حکومت بنانے کا موقع ملا تو انھوں نے اپنے قدیم اور مذہبی نام "بھارت" کو اپنے دستور کا حصہ بنالیا۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ تقسیم ہند سے پہلے کے واقعات بیان کرتے ہوئے ہند یا ہندوستان کا لفظ مناسب ہے، تقسیم کے بعد اسے بھارت یا انڈیا ہی کہا جانا چاہیے۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو دہلی کے متعلق بتاؤں میں چاہوں گا کہ کچھ باتیں قرول باغ سے متعلق بھی آپ کے سامنے پیش کی جائیں۔

قرول باغ : جہاں کبھی مسلمان اکثریت میں رہتے تھے

قرول باغ نئی دہلی سے کچھ فاصلے پر واقع ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریزوں نے دلی کو پایہ تخت بنانے کا فیصلہ کیا تو اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس علاقے کے اندر ایک بڑی مارکیٹ جس کا نام کناٹ پیلس ہے، کو بھی بنانے کا منصوبہ بنایا۔اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی جائے گی۔ کناٹ پیلس کے علاقہ میں موجود آبادیوں کو ختم کرکے لوگوں کو قرول باغ کے علاقے میں بسایا گیا۔اس طرح یہ علاقہ باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ بنایا گیا تھا۔ اس بات کی تصدیق یہاں کی ترتیب سے بنی ہوئی گلیاں اور بازاروں سے بھی ہوتی ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرح سے یہ ایک نئی آبادی ہے۔ یاد رہے کہ لاہور میں بھی قرول گھاٹی اور قرول بازار شالامار اور شاہدرہ کے علاقہ میں موجود ہے۔ قرول کا معنی کیا ہے، کیوں یہ دہلی اور لاہور میں ایک

ساتھ پایا جاتا ہے، باوجود کوشش کے معلوم نہ کر سکا، یقیناً یہ نام کوئی تاریخی حیثیت ہی رکھتا ہوگا۔

اس علاقہ کی اہمیت کا اندازہ آپ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ یہاں پر ایک طبیہ کالج، خالصہ کالج اور دہلی یونیورسٹی موجود ہیں۔ طبیہ کالج کا افتتاح مہاتما گاندھی نے 1921ء میں کیا تھا۔اس کالج کا آغاز حکیم عبدالمجید صاحب نے کیا جسے بعد میں حکیم اجمل خاں صاحب نے طب کی بلندیوں تک پہنچایا۔ اس کی تعمیر کا آغاز انگریز وائسرائے نے کیا جبکہ افتتاح مہاتما گاندھی نے کیا تھا۔ پہلے پہل اس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی اکثریت پاکستان چلی گئی اور پاکستان سے آنے والے ہندو اور سکھ اس علاقہ میں آباد ہوئے اور اب اس علاقہ میں مسلمان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی تفصیل سدھر تھارائے نے ہندوستان ٹائمز میں A tale of two cities کے نام سے لکھی ہے[3]۔ اس علاقے میں مدراس اور بنگال سے تعلق رکھنے والے افراد بھی ایک کثیر تعداد میں بستے ہیں۔

قرول باغ میں ایک بہت مشہور مارکیٹ ہے جس کا نام غفار مارکیٹ ہے۔ یہ نام خان عبدالغفار خان صاحب کے نام پر رکھا گیا جو پاکستان کے ایک مشہور سیاسی رہنما تھے۔ ان کی آزادی ہند میں قربانی کی کوئی مثال پیش کرنا ممکن نہیں ۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بھارت کے لوگ خان عبدالغفار خان صاحب کی کس قدر عزت کرتے ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ خان صاحب تقسیم ہند کے خلاف تھے اور ان کی ہندوؤں سے بڑی اچھی دوستی بھی تھی۔ یہ بات بھی آپ کو یاد ہو کہ ان کے جنازے پر راجیو گاندھی بھی پاکستان آیا تھا۔اندرا گاندھی کے قتل کے بعد دہلی میں سکھوں کو بے دریغ قتل

[3] https://web.archive.org/web/20150702164816/http://www.hindustantimes.com/News-Feed/newdelhi/A-tale-of-two-cities/Article1-740282.aspx

کیا گیا۔ اس وقت سب سے زیادہ نقصان قرول باغ میں بسنے والے سکھوں کا ہی ہوا تھا۔ اس کی تفصیل ویناداس نے Life and Words: Violence and the Descent into the Ordinaryکے نام سے ایک کتاب میں لکھی ہے[4]۔

میں نے ایک اور بات محسوس کی کہ قرول باغ میں رہنے والے اکثر لوگ مغربی پنجاب سے آئے ہوئے ہیں۔ اسی لیے ان کی بودوباش مغربی پنجاب جیسی ہی ہے۔ بہت سے لوگ سیالکوٹی اور جہلم کے لہجے میں پنجابی بولتے تھے۔ میں نے کچھ لوگوں سے راہ و رسم بڑھائی اور باتیں شروع کر دیں۔ ان میں سے اکثر نے اپنی نقل مکانی کے واقعات بتائے کہ وہ کس طرح فسادات میں اپنی جان بچا کر بھارت پہنچے تھے۔ اکثر لوگوں نے آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ان مظالم کا احوال سنایا جو ان پر مغربی پنجاب کے مسلمانوں نے ڈھائے تھے۔

مجھے اب تک اُس آدمی کی باتیں یاد ہے جس نے مجھے بتایا کہ ہمارے آباؤاجداد کو سیالکوٹ میں لوگوں نے گھیر لیا اور ان کو زبردستی مسلمان بننے کے لیے کہا اور گائے کا گوشت کھانے کے لیے مجبور کیا اس دوران پولیس آ گئی اور یوں ان کا دھرم بچ گیا۔

اس موقع پر مجھے یاد آیا کہ ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں میں رہنے والے میری والدہ کے خاندان کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ پورا خاندان ایک سال سے زائد عرصہ تک ایک سکھ سردار کی پناہ میں سکھ بن کر رہا اور پھر ایک دن سکھ سرادر نے اپنی بیل گاڑی میں میری والدہ کے خاندان کے تمام افردا کو بٹھایا اور چالیس کلومیٹر دور انبالہ مہاجر کیمپ میں پہنچایا۔ اس قافلے کی حفاظت کے لیے سکھ سردار نے گاؤں کے

[4] https://books.google.com.pk/books?id=xNp0sBcfF0wC&q=%22Karol+Bagh%22+-inpublisher:icon&pg=PA137&redir_esc=y#v=snippet&q=%22Karol%20Bagh%22%20-inpublisher%3Aicon&f=false

نوجوانوں پر مشتمل ایک جتھہ بھی ساتھ بھیجا۔ میری والدہ کے خاندان کا دھرم اور جان تو بچ گئی تھی لیکن وہ ایک نوجوان خاتون جسے سکھوں نے اغوا کر لیا تھا جو ایک دوسرے گاؤں میں رہتی تھی کو بچا کر اپنے ساتھ نہ لا سکے۔ اس واقعہ کی تفصیل حصہ دوم میں دی گئی ہے۔

جس کا دکھ نا ختم ہونے والا ہے، اب ستر سال بعد بھی اس خاتون کی یاد میں آنسو بہائے جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ ناحق قیمت جو تقسیم ہند کی وجہ سے عام لوگوں کو دینی پڑی, تقسیم ہند کا فیصلہ تو لاگو ہونا ہی تھا، لیکن نقل مکانی کا ذکر کہیں نہیں تھا!

نقل مکانی کے دوران میں کتنے لوگ قتل ہوئے اور کتنا مالی نقصان ہوا، اس کا اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تقسیم ہند کے نتیجے میں پندرہ سے بیس لاکھ لوگ قتل ہوئے اور ڈیڑھ سے دو کروڑ لوگوں نے نقل مکانی کی۔ مالی نقصان کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان بیس لاکھ لوگوں میں نہ کوئی مسلمان لیڈر، نہ کوئی ہندو لیڈر اور نہ ہی کوئی سکھ لیڈر شامل تھا۔ اس قتل و غارت میں عام لوگوں کا ہی جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس بارے میں مختلف اعداد و شمار سامنے آتے ہیں۔ بی بی سی کی رپورٹ جو Steven Brocklehurst نے لکھی ہے کے مطابق پندرہ لاکھ قتل ہوئے اور ڈیڑھ کروڑ لوگوں نے نقل مکانی کی[5]۔

مشرقی پنجاب کے سکھوں اور ہندوؤں نے قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع کیا تو رد عمل کے طور پر مغربی پنجاب میں رہنے والے مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کا بدلہ مقامی سکھوں اور ہندوؤں کو قتل کر کے لیا۔ کچھ کا یہ کہنا ہے کہ قتل و غارت کا آغاز

---

[5] https://www.bbc.com/news/uk-scotland-40874496

راولپنڈی کے قریب ایک گاؤں میں سکھوں کے قتل سے ہوا، جس کے نتیجہ میں مشرقی پنجاب میں اس کا بدلہ بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر لے لیا گیا۔ کس نے اس قتل و غارت گری کا آغاز کیا؟

اس بارے میں متضاد دعوے موجود ہیں۔ نقصان دونوں طرف ہوا کہیں کم اور کہیں زیادہ۔ اس کا درد صرف وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کے خاندان اُس مشکل وقت سے گزرے ہیں۔



Hakim Ajmal Khan Founder of Tibbia College Photo Credit: https://en.bharatpedia.org.in

i Chopra

قرول باغ میں پختون آبادی

قرول باغ میں، میں ایک دن رکشے میں بیٹھا تھا مجھے محسوس ہوا کہ رکشے کا ڈرائیور اپنی شکل و صورت اور لب و لہجے کی وجہ سے پختون لگ رہا ہے۔ میں نے اپنے شک کو رفع کرنے کے لیے ان سے پوچھا کیا آپ پٹھان ہیں؟ انھوں نے جواب دیا، ہاں میں پٹھان ہوں اور میرا تعلق افغانستان سے ہے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ ایک افغان بھارت میں کیوں اور کب آیا؟ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کب سے یہاں رہ رہے ہیں؟



Ghafar Market Karol Bagh Photo Credit: Aart

جواب میں اُس نے مجھے بتایا کہ جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو بہت سے لوگ مہاجر بن کر پاکستان چلے گئے۔ اس دوران بھارت کی حکومت نے ایک ہزار کے قریب افغانی لوگوں کو بھارت میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ میں پچھلے پندرہ سال سے بھارت میں رہ رہا ہوں۔ افغانستان سے آنے والے سب لوگوں کو قرول باغ میں رہنے کی جگہ دی گئی ہے۔ ہمارے پاس بھارتی شہریت تو نہیں ہے لیکن یہاں پر رہنے اور

کام کرنے کی اجازت ہے۔ اس طرح سے افغانیوں کی ایک بڑی تعداد قرول باغ میں رہ رہی ہے۔ میرے لیے یہ باعث حیرت تھا لیکن مزید غور کرنے پر مجھے محسوس ہوا کہ جہاں غفار مارکیٹ ہو گی وہاں پر افغان لوگوں کا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو دہلی میں اپنے گزرے وقت کی باتیں بتاؤں، میں چاہوں گا کہ آپ کو دہلی کے بارے میں کچھ آگاہ کروں۔

دہلی یا دلی

دہلی ان شہروں میں سے ہے جس کے دو نام ہیں، دہلی اور دلی۔ انگلش میں لکھتے وقت اسے دہلی لکھا جاتا رہا ہے جبکہ پنجابی, ہندی, اردو میں اسے دلی لکھا جاتا رہا ہے۔ اب بھی عام بول چال میں لوگ اسے دلی ہی کہتے ہیں۔ اردو شاعری میں یہ بات بہت واضح ہے کہ اس شہر کو دلی ہی کہا جاتا رہا ہے۔ اب بھارت کی حکومت نے اسے باقاعدہ دہلی کے نام سے لکھنا شروع کیا ہے۔ دنیا کے نقشے پر اس شہر کو دہلی کے نام سے ہی لکھا جاتا ہے۔ اس لیے میں بھی اسے دہلی ہی لکھوں گا۔ البتہ تقسیم ہند سے پہلے اور تاریخی واقعات لکھتے ہوئے دلی لکھنا مناسب ہو گا۔ اب بھارت میں شائع ہونے والے اردو اخبارات اور رسائل میں اسے دہلی ہی لکھا جاتا ہے۔

اس شہر کا نام دلی کیوں پڑا؟ اس کے متعلق ہمیں تاریخ سے مختلف حوالے ملتے ہیں۔ ایک بات تو یہ پتہ چلتی ہے کہ دلوں یا ڈھلوں نام کا ایک بادشاہ تھا، جس نے 50 قبل مسیح میں اس شہر کو آباد کیا اور اس کا نام اپنے نام پر رکھا۔ یاد رہے کہ جاٹ قوم کی ایک گوت، ڈھلوں مشرقی اور مغربی پنجاب میں اب بھی رہتی ہے۔ دوسری وجہ کچھ لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ دہلی اور پشاور کے درمیان موجود علاقہ کو پنجاب کہتے تھے اور پنجاب کے بعد جمنا کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ دلی کو جمنا کے علاقہ کا دروازہ کہتے تھے۔

دروازے کا ایک دوسرا نام دہلیز بھی تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس کی وجہ سے اس کا نام دلی پڑ گیا۔ کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں ہے۔ بہر حال اب یہ دہلی ہے اور بھارت کا دارالحکومت ہے۔ کچھ لوگ اس شہر کے نئے بسائے جانے والے حصے کو نیو دہلی اور قدیم شہر کو اندرون دلی کہتے ہیں۔ اس بارے میں بخشی آر ایس کی کتاب Delhi Through Ages ایک مفید کتاب ہے[6]۔

ایک اندازے کے مطابق دہلی شہر کی تاریخ تقریباً ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ ڈھائی ہزار سال کی تاریخ عجیب و غریب اور نہایت دلچسپ ہے۔ یہ سفر نامہ اس طویل تاریخ کو بیان کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں چند چیدہ چیدہ باتیں ہی آپ کے سامنے رکھوں گا۔

یہاں مہاراجہ اشوکا کے دور کی باقیات بھی ملتی ہیں جو 300 قبل مسیح میں ہو گزرا ہے۔ اس کے بعد اس پر کئی اور حکمرانوں نے بھی حکومت کی۔ محمود غزنوی نے 1001ء میں پہلی مرتبہ ہندوستان پر حملہ کیا اور پشاور میں ہندو راجہ کو شکست دی اور اس کے بعد اس نے دلی کے علاقے فتح کیے۔ اس طرح سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گیارویں صدی کے آغاز میں پہلی مرتبہ مسلمان دلی آئے۔ اس بارے ایک تفصیل مضمون انسائکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں موجود ہے[7]۔

بارہویں صدی میں پرتھوی راج چوہان نے اس شہر کو فتح کیا۔ بارہویں صدی کے آخر تک اس علاقہ پر ہندوؤں کی حکومت تھی۔ محمد غوری نے پرتھوی راج کو شکست

---

[6] Bakshi, S.R. (1995) [2002]. *Delhi Through Ages*. Whispering .Eye Bangdat. p. 2. ISBN 978-81-7488-138-0

[7] https://www.britannica.com/biography/Mahmud-king-of-Ghazna

دی اور تیرہویں صدی کے آغاز میں دلی اور اس کے آس پاس کے علاقہ پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی جو انگریزوں کے آنے تک کسی نہ کسی حال میں موجود رہی۔

مسلمان ایک طویل عرصہ تک اس علاقہ پر حکمران رہے جن میں غزنوی، ایبک، مغل، امیر تیمور، احمد شاہ درانی اور نادر شاہ نمایاں نام ہیں۔ یاد رہے کہ مسلمان کبھی بھی ہندوستان میں اکثریت میں نہیں رہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کے مشرقی علاقوں یعنی موجودہ بنگلہ دیش اور مغربی علاقوں (موجودہ پاکستان) میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن مرکزی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد دیگر قوموں کے مقابلہ میں واضح طور پر کم تھی۔ بھارت میں 2011ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں مسلمان آبادی کا پندرہ فیصد اور ہندوؤں کی تعداد اسی فیصد تھی تھے۔ جبکہ 1951ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق مسلمان آبادی کا دس فیصد اور ہندوؤں کی تعداد 84 فیصد تھی[8]۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کی شرح میں اضافہ ہندوؤں سے زیادہ ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ 2021ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی شرح میں اضافہ کی امید کی جاتی ہے۔ اسدالدین اویسی کے مطابق اس وقت بھارت میں مسلمانوں کی تعداد پچیس کروڑ ہے جو کل آبادی یعنی ایک سو چالیس کروڑ کا اٹھارہ فیصد بنتے ہیں۔

دہلی اور انگریز

مغل حکومت کے آخری دور میں حکومتی معاملات میں انگریزوں کا عمل دخل خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ 1803ء میں مراٹھوں کے ساتھ انگریزوں کی دوسری جنگ ہوئی جس میں انگریزوں نے مراٹھوں کو شکست دی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے

[8] https://censusindia.gov.in

آہستہ آہستہ مغل حکمرانوں پر بھی مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے دلی کا محاصرہ کیا اور بہادر شاہ ظفر کو ملک بدر کر کے دلی پر باقاعدہ قبضہ کر کے اسے پنجاب کا ایک ضلع بنا دیا۔

یاد رہے 1849ء میں انگریزوں نے سکھوں کے ساتھ چیلیانوالہ میں اپنی آخری لڑائی لڑی تھی جس میں انھوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر اپنا قبضہ مکمل کر لیا۔ س وقت تک انگریز ہندوستان کے بیشتر حصے پر قبضہ کر چکے تھے۔ میرے خیال میں چیلیانوالہ کی لڑائی کے بعد انگریزوں کو کسی جگہ بھی کسی بڑی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ 1911ء تک انگریز سرکار کا مرکزی دفتر کلکتہ میں ہوتا تھا، بعد میں انگریزوں نے دلی کو اپنا دارالحکومت بنایا اور نئی دہلی کے نام سے ایک علاقہ آباد کیا۔ فروری 1931ء میں اس کا افتتاح کیا گیا اور اسے یونین آف انڈیا کا کیپٹل بنا دیا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد بھارتی حکومت نے بھی نیو دہلی کو ہی اپنا کیپٹل بنایا۔ اب اس علاقے میں ایک نیو دہلی ہے اور ایک پرانی دلی ہے۔ دونوں کے درمیان چند کلو میٹر ہی کا فاصلہ ہے لیکن انکی معاشی اور معاشرتی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

دہلی کے اندر بے شمار تاریخی عمارات ہیں جن کے متعلق اگلے صفحات میں ذکر ہو گا۔ اس شہر کی تاریخ بہت دلچسپ ہے، اگر آپ کو تاریخ سے دلچسپی ہے تو آپ دلی اور دہلی کی تاریخ ضرور پڑھیں۔

ایک دن جب شرما صاحب مجھے ہوٹل چھوڑنے جا رہے تھے تو جب ہم نئی دہلی کے پاس سے گزرے اس وقت ہماری ایک جانب بھارتی حکومت کے مرکزی دفاتر اور اسمبلی کی عمارت تھی۔ میں نے شرما صاحب سے پوچھا کہ جب آپ اندرون دلی کی تنگ گلیوں سے نکل کر اس وسیع و عریض علاقے میں آتے ہیں اور اتنی خوبصورت عمارات کو

دیکھتے ہیں، جہاں بہت بڑے بڑے لان ہیں اور انتہائی صاف ستھرا علاقہ موجود ہے تو آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارے حکمران تو بدلے ہیں مگر انداز حکمرانی نہیں۔

آج بھی اس شہر کے مختلف علاقوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک طرف وہ رہتے ہیں جنھیں انسان کہلانے کا بھی حق نہیں ہے اور دوسری طرف وہ انسان رہتے ہیں جنھیں دنیا کی تمام تر آسائشیں میسر ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پرانی دلی میں ابھی بھی سائیکل رکشہ چلتا ہے۔ کیا ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اس سائیکل رکشہ کو ایک چھوٹا سا انجن لگوا دیں تاکہ اس آدمی کی مشقت میں کمی آسکے۔

لیکن ایسا نہیں ہو رہا اور یہ کب ہوگا معلوم نہیں !

میں ایک دن جب شرما صاحب کے ساتھ کہیں جا رہا تھا تو میں نے ایک بڑے گراؤنڈ میں ایک فیملی کو بیٹھے دیکھا جو میاں بیوی اور دو تین بچوں پر مشتمل تھی۔ اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ عام سے لوگ لگ رہے تھے، ان کے قریب ہی ان کی ایک پرانی موٹر بائیک بھی کھڑی تھی۔ میں نے انھیں دیکھ کر شرما صاحب سے کہا کہ آپ ہی بتایئے کہ جب یہ لوگ شام کو اپنی گلی میں جائیں گے جہاں صفائی ستھرائی نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی اور جہاں گلیوں میں گٹر کا پانی چل رہا ہوگا تو ان کے دل میں کیا خیال آئے گا؟ یقیناً اس سے ایک نفرت جنم لے گی۔

بد قسمتی سے حکمران بدلنے کا اختیار تو جمہوریت نے عوام کو دے دیا ہے مگر انداز حکمرانی بدلنے کا اختیار اب بھی عوام کے پاس نہیں ہے!

یہ منظر میں روز دیکھتا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں لاہور میں ہوں جہاں پنجاب کے گورنر کے رہنے کے لیے ساٹھ ایکڑ سے زائد جگہ ہے اور اسی لاہور میں ایسی

بستیاں بھی موجود ہیں، جہاں ایک ایکڑ میں پانچ سو سے زائد لوگ رہتے ہیں۔ میرے خیال میں بھارت اور پاکستان میں ایک مشترکہ بات یہ ہے کہ حکمران تو بدلتے رہتے ہیں اور وہ اپنی باری پر آتے اور جاتے ہیں۔ مگر یہ طے ہے کہ کوئی بھی انداز حکمرانی بدلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

جب تک انداز حکمرانی نہ بدلا گیا تب تک عوام کے حالات بدلنے کا کوئی امکان نہیں ہے!

پرانی دلی: میرا ایک رومانس

مجھے پرانے شہروں سے ایک فطرتی انس ہے۔ اسی لیے مجھے پرانی گلیوں اور محلوں میں گھوم پھر کر بے حد خوشی ہوتی ہے اور میں تصور میں خود کو صدیوں پیچھے لے جاتا ہوں۔ جب کبھی میں نے دہلی کے متعلق سوچا تو اسے دیکھنے کی خواہش حد سے زیادہ بڑھ گئی کیونکہ دہلی کی بات ہی کچھ اور ہے۔

آج دہلی میں میرا دوسرا دن تھا۔ میں جس کمپنی کی دعوت پر بھارت آیا تھا اس کمپنی کے مالک کا نام درشن چوہدری تھا۔ ان کا دفتر پرانی دلی میں تھا۔ آج ہمارا پروگرام ان کے دفتر جانے کا تھا۔ شرما صاحب مجھے لے کر ان کے پاس چلے گئے۔ تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں کیمیکلز کی ایک بہت بڑی مارکیٹ تھی۔

جب آپ ایک دفعہ اندرون دلی چلے جائیں اور تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کرکے دوبارہ کھولیں تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو یہ محسوس بھی نہیں ہوگا کہ آپ لاہور میں نہیں ہیں۔ آپ صرف یہ فرق محسوس کریں گے کہ اندرون دلی کے اکثر لوگ آپ کو اردو بولتے نظر آئیں گے، جبکہ اندرون لاہور میں آپ کو زیادہ تر

لوگ پنجابی میں بات کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔آپ کو کوئی اور فرق محسوس بھی نہیں ہوگا۔ فرق ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ دونوں شہر صدیوں تک ایک جیسے حکمرانوں کے تحت ہی رہے ہیں۔ اس لیے دونوں شہروں کے طرزِ تعمیر اور بودو باش میں بے حد مماثلت ہے۔

کیمیکلز کی مارکیٹ بالکل لاہور کی اکبری منڈی کی طرح ہے، جہاں بے شمار دفاتر ہیں اور لوگ کیمیکلز کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔ میں درشن چودھری کے دفتر چلا گیا وہ ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ لیکن اس میں کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ ان سے ہونے والی بات چیت انتہائی دلچسپ ہے۔ وہاں درشن چودھری کے برادرِ نسبتی، کنہیالال بھی موجود تھے۔ ان سے ہونے والی گفتگو کی چند اہم باتیں میں آپ کے سامنے ضرور رکھنا چاہوں گا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب 1984ء میں اندرا گاندھی کو قتل کیا گیا تو اس کے بعد دہلی میں کئی ہزار بے گناہ سکھوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت ہی اندوہناک واقعہ ہے جسے بھلانا خاص طور پر سکھوں کے لیے تو ممکن نہیں ہے۔ اُدھر پنجاب میں رہنے والے ہندو بھی اچھی خاصی مشکل کا شکار ہو گئے۔ کنہیالال نے بتایا کہ ان کا خاندان پنجابی ہے اور چندی گڑھ کے پاس ان کی رہائش تھی۔ جب سکھوں کو دہلی میں قتل کیا گیا انھیں بھی پنجاب میں سکھوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا اور بہت سارے ہندوؤں کو سکھوں نے قتل کر دیا۔ ایسی صورتحال میں جو ہندو اس قابل تھا کہ وہ نقل مکانی کر سکے اس نے پنجاب چھوڑ دیا۔ ہمارا کاروبار پہلے سے ہی دہلی میں تھا اور ہمارے کچھ رشتہ دار بھی یہاں دہلی میں رہتے تھے۔ اسی لیے ہم پنجاب چھوڑ کر دہلی میں آ گئے مگر ہمارا دل ابھی بھی پنجاب میں ہی ہے جہاں ہم صدیوں سے رہ رہے تھے۔ ہم اب بھی اپنے گھروں میں پنجابی زبان ہی بولتے ہیں۔

انھوں نے مجھے بے شمار واقعات سنائے اور سچی بات تو یہ ہے کہ جب بھی میں ہجرت کا کوئی واقعہ سنتا ہوں تو مجھے اپنے بزرگوں کی ہجرت کا واقعہ یاد آجاتا ہے . ایسے حالات میں کئی بے گناہ مارے جاتے ہیں۔ اسی طرح بے گناہ لوگ پنجاب میں بھی مارے گئے۔

نہ سکھوں کا کوئی لیڈر مرا، نا ہی کوئی ہندوؤں کا لیڈر۔۔۔ مرے تو بیچارے عام بے گناہ لوگ۔۔۔

کنہیا لال ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔ انھوں نے جو بات 1996ء میں کہی اب 2020ء میں سچ ثابت ہو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں مسلمانوں، جن کو وہ محمڈن کہتے تھے، کی آبادی میں بے حد اضافہ ہو رہا ہے۔ ان میں اکثریت غریب لوگوں کی ہے جو زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں۔ جب کہ ہندو لوگوں کی اکثریت امیر ہے اور وہ کم بچے پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ آنے والے وقتوں میں محمڈن کی تعداد بڑھ جائے گی اور ہندو آہستہ آہستہ اقلیت میں چلے جائیں گے۔ اس کا صرف ایک ہی حل ہے کہ محمڈن معاشی ترقی کریں تاکہ وہ کم بچے پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں۔ آج بھارت کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے اور ہندو جس خوف کا اظہار کر رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے یہ بات ایک پڑھے لکھے ہندو سے پچیس سال پہلے سنی تھی۔

پرانی دلی در اصل وہ علاقہ ہے جسے شاہ جہاں نے 1639ء میں آباد کیا اور آگرہ سے اپنا تخت اس علاقہ میں منتقل کیا۔ یہ بالکل اندرون لاہور ہی کی طرح کا ایک علاقہ ہے۔ اس علاقے کے ساتھ ایک مسجد اور قلعہ بھی ہے، بالکل اسی طرح لاہور میں بھی اندرون لاہور کے ساتھ ایک مسجد اور قلعہ ہے۔ یاد رہے کہ مغلوں نے مختلف ادوار میں، دلی، لاہور اور آگرہ، تینوں شہروں کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ شاہ جہاں نے دلی شہر

کے چاروں طرف ایک بلند دیوار بنائی تھی جس میں کئی دروازے تھے۔ میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ مغلوں نے جہاں بھی شہر تعمیر کیے وہ اکثر دریاؤں کے کناروں پر ہیں، مثلاً لاہور راوی کے کنارے پر، آگرہ اور دہلی جمنا کے کنارے، وغیرہ وغیرہ۔

یاد رہے مغلوں سے پہلے سلاطین دہلی، تغلق اور سوری بھی اس علاقے میں رہے ہیں لیکن انھوں نے باقاعدہ شہر کو آباد نہیں کیا۔ دلی شہر کو آباد کرنے کا سہرا شاہجہاں کے سر ہی ہے۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ دلی کو آباد کرنے میں سب نے اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے مگر شاہجہاں نے اسے باقاعدہ ترقی دی۔

دہلی میں موجود مشہور عمارتوں کا ذکر میں آئندہ صفحات میں کروں گا۔ فی الحال اتنا ہی بتانا مقصود ہے کہ مغلوں نے آخری وقت تک دلی کو ہی اپنا دارالحکومت بنایا اور بعد ازاں جب انگریزوں نے اس علاقہ کو فتح کیا تو انھوں نے بھی 1911ء میں پرانی دلی کے ساتھ نیا شہر آباد کرکے اپنے تمام دفاتر اس نئے علاقہ میں منتقل کر لیے۔

شرما صاحب کے پاس میں دوپہر تک رہا بعد میں میں نے ان سے کہا کہ میں اندرون دلی کچھ جگہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔انھوں نے کہا کہ آپ شام چھ بجے سے پہلے پہلے واپس آ جائیں تاکہ ہم آپ کو ہوٹل چھوڑ دیں۔ اس دوران میں نے جو کچھ دیکھا اس کا احوال پیش خدمت ہے۔



Old Dehli Photo Credit:Pinterest

جامع مسجد دہلی

جب میں نے پہلی مرتبہ جامع مسجد کو دیکھا تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں لاہور کی بادشاہی مسجد کو دیکھ رہا ہوں۔ دونوں مساجد میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ مماثلت اس وجہ سے بھی ہے کہ دونوں ہی کے بنانے والے مغل بادشاہ تھے، یعنی شاہجہاں اور عالمگیر۔ ظہر کی نماز کے وقت مسجد کے شمال مشرقی کونے میں بے شمار کبوتر موجود تھے۔ لوگ انھیں دانا ڈال رہے تھے۔ ایک اور بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں کراچی کی کسی بڑی مسجد میں ہوں جہاں اکثریت کا لباس سفید قمیص اور پاجامہ تھا اور زبان بھی ان جیسی ہی تھی۔

یہ مسجد جس کا اصل نام "مسجد جہاں نما" ہے لیکن اب اسے جامع مسجد دہلی کہا جاتا ہے۔ اس مسجد کو شاہ جہاں نے 1656ء میں تعمیر کروایا تھا۔ اس مسجد کو بنانے کے

لیے پانچ ہزار لوگوں نے پانچ سال تک کام کیا۔ شاہ جہاں نے بخارا سے سید عبدالغفور شاہ بخاری صاحب کو بلا کر اس مسجد کا افتتاح کروایا تھا۔ اس مسجد کے دو بڑے مینار ہیں جن کی بلندی تقریباً ایک سو تیس فٹ ہے ۔ اس کے علاوہ اس مسجد کے تین گنبد بھی ہیں۔ مسجد میں پچیس ہزار لوگ بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے بعد جہاں مسلمانوں پر بُرا وقت آتا ہے وہاں اس مسجد کے حالات بھی خراب ہوئے۔ انگریزوں نے اس کے متعلق بہت عجیب و غریب فیصلہ کیا۔ وہ اسے گرانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بغاوت کرنے والے لوگوں کا مرکز اس مسجد میں واقع تھا لیکن بعد میں انھوں نے اپنا فیصلہ بدل لیا اور یوں مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

یہ اللہ کا گھر تھا اسے کون نقصان پہنچا سکتا تھا۔ یہ میرا ایمان ہے !

اگر آپ کو دلی جانے کا موقع ملے تو آپ اس مسجد میں نماز کے لیے ضرور جائیں، مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کو بہت لطف آئے گا۔ ایک اونچی جگہ مسجد اور اس کے چاروں طرف بارونق بازار ، ایک ناقابلِ فراموش منظر آپ کو مدتوں یاد رہے گا۔ نماز کے وقت بہت ہی خوبصورت اذان دی جاتی ہے اور لوگ جوق در جوق نماز کے لیے آتے ہیں۔ یہ منظر بہت ہی خوبصورت لگتا ہے۔ لاہور کی بادشاہی مسجد پرانے لاہور شہر سے ایک طرف ہونے کی وجہ سے عام نمازوں میں اتنا رش نہیں ہوتا جتنا جامع مسجد دہلی میں ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس مسجد کا شہر کے اندر ہونا ہے۔

اللہ رب العزت اس مسجد کے بنانے والوں کو اس کا بہترین اجر عطا فرمائے

آمین !



Jamia Mosque Dehli Photo Credit: Pinterest

دہلی کے آٹھ دروازے

پرانی دلی کے مشرق میں دریائے جمنا بہتا ہے۔لال قلعہ شہر اور دریا کے درمیان ہے اس لیے شہر کی طرف جانے والے آٹھوں دروازے شمال، مغرب اور جنوب کی طرف ہیں۔ میں شمال میں واقع کشمیری گیٹ سے شہر میں داخل ہوا تھا۔ان دروازوں کی صورتحال بالکل لاہور کے دروازوں جیسی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ماضی میں سارا شہر چار دیواری کے اندر تھا جس کے چاروں طرف بڑے بڑے گیٹ تھے جو آمدورفت کے لیے دن میں کھولے جاتے تھے۔ کچھ کی باقیات تو ابھی بھی ہیں لیکن وہ بہت اچھی حالت میں نہیں ہیں۔

ان کے نام بھی لاہور کے دروازوں کی طرح ہی ہیں، یعنی کشمیری گیٹ، موری گیٹ ،لاہوری گیٹ، دہلی گیٹ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے سب دروازوں میں جانے کا موقع تو نہیں ملا لیکن کشمیری اور موری گیٹ دیکھنے کا مجھے اتفاق ضرور ہوا۔ لاہور کے موری گیٹ

میں سائیکل رکشہ نہیں ہے جبکہ اس وقت دلی میں سائیکل رکشہ عام تھا اور اسے چلانے والے اکثر لوگ مسلمان تھے۔ مجھے سوائے اس کے کوئی اور فرق محسوس نہ ہوا۔

ایک نوجوان رکشہ ڈرائیور سے میں نے بات کرنے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن اس نے صرف اتنا کہا کہ صاحب ہمارا یہی مقدر ہے جو لکھنے والے نے لکھ دیا ہے۔۔۔ میں نے اس سے کہا کہ "آپ اسے بدل سکتے ہیں۔۔۔ اگر آپ کوشش کریں"۔۔۔ اس نے جواب میں کہا کہ

"کہنا آسان ہے لیکن کرنا بہت مشکل ہے"۔۔۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی سائیکل آگے بڑھا دی۔۔۔ اور میں ایسے بادشاہوں کے بنائے ہوئے قلعہ کی طرف چل پڑا جنھوں نے عمارات کو تعلیم و تربیت پر ترجیح دی۔۔۔ آج پھر ان ہی کو سلام کرنے جا رہا ہوں۔۔۔

کہتے ہیں کہ اب دلی میں یہ سائیکل رکشہ ختم کر دیا گیا ہے۔ پاکستان میں بھی اکثر جگہوں پر سائیکل رکشہ ختم کر دیا گیا ہے۔ لیکن گزشتہ سال ڈیرہ اسماعیل خان میں مجھے سائیکل رکشہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اللہ کرے یہ بھی جلد ختم ہو جائے اور لوگوں کی مشقت میں کمی واقع ہو۔ آمین!

چاندنی چوک : جسے شاہجہاں کی بیٹی نے ڈیزائین کیا

کہتے ہیں کہ شاہجہاں کی تعمیر کردہ بیشتر عمارتوں کے پیچھے اس کی بیٹی جہاں آرا کا ہاتھ تھا۔ معلوم نہیں کہ یہ بات کہاں تک سچ ہے لیکن پرانی دلی کے چاندنی چوک کے متعلق سب کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اسے جہاں آرا نے ہی ڈیزائن کیا تھا۔ یہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ چوک بھی شاہجہاں کے دور ہی کی ایک یادگار ہے۔ قلعہ اور جامع مسجد کے پاس یہ چوک نصف چاند کی مانند ہے اس میں سے تین بازار، اردو بازار، جوہری بازار اور

فتح پوری بازار نکلتے ہیں۔ اس چوک کے درمیان ایک گھنٹہ گھر بنادیا گیا ہے جہاں پر کبھی ایک تالاب ہوا کرتا تھا۔ تالاب کے پانی پر جب چاند کی روشنی پڑتی تھی تو اس سے منظر بے حد سہانا ہو جاتا تھا۔ اسی روشنی کی وجہ سے اس چوک کا نام چاندنی چوک رکھا گیا۔ قلعہ کے قریب ہونے کی وجہ سے، قلعہ کی خواتین کے لیے ایک دن مخصوص تھا جس دن وہ اس بازار سے خریداری کرتی تھیں۔

جب میں جامع مسجد سے اس چوک میں پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں لاہور کے بھاٹی چوک میں ہوں، اسی طرح کارش اور اسی طرح کا طرز تعمیر، سب کچھ ویسا ہی لگ رہا تھا، مجھے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

اس وقت چاندنی چوک میں موجود مختلف مارکیٹیں لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ مجھے خریداری سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن میں پھر بھی مختلف مارکیٹوں میں گیا۔ مجھے جو بات مختلف لگی وہ دکانداروں کا رویہ تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ ان کی اردو تو بہت اچھی ہے لیکن لہجے میں سختی ہے، جو مجھے بھلی نہ لگی۔ میں نے کچھ لوگوں سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے میری بات کی تائید کی کہ ہاں ایسا ہی ہے۔ اس کی وجہ اہلِ دلی کا تفاخر ہو سکتا ہے۔ دلی کے مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ انکے آباؤاجداد نے دلی میں بیٹھ کر پورے بھارت پر حکومت کی ہے۔ دوسری وجہ ان کا یہ بات سمجھنا بھی ہو سکتی ہے کہ وہ بھارت میں مسلمانوں کی تہذیب کے قدیمی وارث ہیں۔ یہ میرا خیال ہے جو کہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔



Chandni Chowk Old Dehli Photo Credit:
https://zeenews.india.com



Chandni Chowk: In old times, Photo Credit:
https://www.firstpost.com/

حویلی مرزا غالب: ناقدری کی انتہا

میں نے چاندنی چوک میں ایک مناسب وقت گزارا۔ یوں تو آپ بھارت کے کسی بھی شہر میں جائیں تو آپ کو مختلف قومیت کے لوگ مل جاتے ہیں۔ لباس اور وضع قطع میں فرق ہی سے آپ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص کس قوم اور کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ چاندنی چوک میں مجھے محسوس ہوا کہ اس علاقہ کے لوگوں کی اکثریت ایک جیسے لباس یعنی قمیض پاجامہ وغیرہ پہنے ہوئے تھی اور وضع قطع سے وہ مسلمان لگ رہے تھے۔ میں نے وہاں بہت کم سکھوں کو دیکھا۔ مجھے تھوڑی حیرانی بھی ہوئی۔ بعد میں مجھے کسی نے بتایا کہ غیر مسلم لوگ جامع مسجد اور اس کے آس پاس جانے سے گھبراتے ہیں اور خاص طور پر رات کو تو بالکل نہیں جاتے۔ اس کی وجہ سوائے خوف کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

چاندنی چوک کے بعد قریب ہی محلّہ بلی ماراں میں مرزا غالب کی رہائش گاہ موجود تھی۔ اب میری اگلی منزل مرزا غالب کا گھر تھا۔ میں نے کسی سے ان کے گھر کا پتا پوچھا، جو مجھے آسانی سے مل گیا۔ مین بازار سے تھوڑا سا ہٹ کے ایک گلی نکلتی تھی جس کا نام گلی قاسم جان ہے۔ اس میں تقریباً پچاس گز کے بعد دائیں طرف ان کا گھر تھا۔ اس گھر میں مرزا غالب 1860ء سے 1869ء تک رہائش پذیر رہے۔

ایک بات کا مجھے کس قدر افسوس ہوا ہوگا جس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں، جب میں نے دیکھا کہ مرزا غالب کے گھر کے اندر کئی دکانیں بنی ہوئی ہیں اور ایک عظیم شاعر کے گھر کی کوئی بھی نشانی وہاں موجود نہیں تھی۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا۔ مجھ میں وہاں پر زیادہ دیر کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی اسی لیے میں جلد ہی واپس بازار میں آ گیا۔ ایک عظیم شاعر کے ساتھ بھارت کی حکومت کا یہ سلوک مجھے پسند نہ آیا۔

مجھے سب سے زیادہ افسوس اہل دلی پر ہوا، ان کے اس سلوک کی وجہ سے جو انھوں نے مرزا غالب کے ساتھ کیا۔ اگر یہ کام حکومت نہیں کر سکتی تھی تو دلی والے اردو کی پہچان اور اردو کو بامِ عروج تک پہنچانے والے شاعر نثر نگار مرزا غالب کی قدردانی کا حق خود تو ادا کر سکتے تھے!

اب جب میں یہ سفر نامہ لکھ رہا ہوں، یعنی سفر کے پچیس سال بعد تو مجھے معلوم ہوا کہ حکومت ہند نے 1999ء میں اس جگہ پر ایک عجائب گھر بنایا ہے اور اس حویلی کو قومی ورثہ قرار دیا ہے۔ یہ سب جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اب یہ ایک شاندار بلڈنگ ہے۔ جسے ہر طریقے سے سجایا گیا ہے، یہاں پر غالب سے متعلق بے شمار اشیاء رکھی گئی ہے۔ غالب کے علاوہ بھی بے شمار نامی گرامی شاعروں کی تصاویر بھی موجود ہیں۔

اپنے مشاہیر کو یاد رکھنا ہم سب کا فرض ہے اسی کو تاریخ کہتے ہیں، ہم بھی تاریخ ہی بناتے ہیں اور ہماری آنے والی نسلیں بھی اپنی تاریخ ہی جاننا چاہیں گی۔

دلی کا اردو بازار، چنیوٹ کا ہندو مگو خاندان، ہندو کتاب فروش، مسلمان کباب فروش

مرزا غالب کے گھر کے بعد میری اگلی منزل اردو بازار تھا۔ بازار جانے سے پہلے میں جامع مسجد کے پاس ایک صاحب سے ملنے گیا جو تفہیم القرآن شائع کرتے تھے۔ یہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے۔ ہمارے فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ایک پیارے دوست محمد یاسین ہیں جو 1990ء میں، ہندوستان سے تفہیم القرآن جو قران پاک کی تفسیر ہے، جسے سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ رحمتہ نے لکھا ہے لا کر پاکستان میں فروخت کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کا بھارت آنا جانا تھا۔ جب میں بھارت جا رہا تھا تو انھوں نے

مجھے اپنے ان دوستوں کا پتہ بتایا جن سے وہ تفہیم القرآن خریدتے تھے اور میں ان سے ملنے کے لیے ان کی دکان پر چلا گیا۔

جامع مسجد کے پاس ہی ان کی دکان تھی، ان کا نام جنید احمد تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں آج تک جتنے بھی ایسے لوگوں سے ملا ہوں جن کی مادری زبان اردو ہو، ان سے اچھی اور صاف ستھری اردو بولتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ میں نے ان سے اس بات کا ذکر بھی کیا۔ جس پر انھوں نے بتایا کہ ہمارے گھر میں اردو کے صحیح تلفظ اور الفاظ کے درست استعمال پر خاصا دھیان دیا جاتا ہے اور دوسرا یہ کہ ہمارے ملنے والوں میں بھی اکثر لوگ وہ ہی ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ اسی وجہ سے ہماری زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات نہیں ہیں۔

جنید صاحب نہایت ہی صاف ستھرے شخص تھے۔ ان کی دکان میں ہر چیز نہایت سلیقہ سے رکھی ہوئی تھی اور خود بھی سمارٹ اور قانون قاعدے کے مطابق زندگی گزارنے والے شخص تھے۔ مجھے ان سے ملے پچیس سال ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک وہ مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ انھوں نے مجھے چائے وغیرہ پلائی، میرا دل تو کر رہا تھا کہ میں ان کے پاس بہت دیر تک بیٹھتا لیکن مجھے واپس بھی جانا تھا۔ اس لیے میں نے ان سے اجازت چاہی۔ ان سے میں نے اردو بازار کے متعلق پوچھا، انھوں نے مجھے اس کے متعلق کچھ باتیں بتائیں۔

انھوں نے بتایا کہ اس وقت بھارت میں کتابیں شائع کرنے کے حوالے سے یہ سب سے بڑی مارکیٹ ہے۔ خاص طور پر اردو میں شائع ہونے والی زیادہ تر کتابیں اسی مارکیٹ سے ملتی ہیں۔ میں اپنے میزبان سے اجازت لے کر اردو بازار کی طرف چلا گیا تاکہ ایک تاریخی بازار کو قریب سے دیکھ سکوں۔

میرے اندازے کے مطابق یہ بازار کئی کلو میٹر طویل ہے۔ تمام عمارتیں تین سے چار منزلہ ہیں، جن میں نیچے سے لے کر اوپر تک کتابوں کی ہی دکانیں پائی جاتی ہیں۔ میرا مقصد کتابوں کی خریداری نہیں تھا میں تو کتابوں کا وہ بازار دیکھنا چاہ رہا تھا جس کا چرچا میں نے بہت سارے لوگوں سے سن رکھا تھا۔

میں نے تاریخی کتب میں یہ پڑھا ہے کہ اردو بازار در حقیقت وہ جگہ ہے جہاں سے اردو کے لفظ کا آغاز ہوا اور اس کا استعمال عام ہوا۔ اس علاقے میں مغلوں اور دیگر بادشاہوں کے لشکروں کے کیمپ ہوا کرتے تھے۔ ان فوجی کیمپوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے یہ بازار قائم کیا گیا تھا۔ لشکروں کی موجودگی کی وجہ سے اس بازار کا نام، اردو بازار پڑ گیا۔ یاد رہے کہ اردو کا مطلب ہی لشکر ہے۔ بعد میں انگریزوں نے بھی اپنا فوجی کیمپ اسی علاقے میں قائم کیا۔

جنگ آزادی کے دوران مجاہدین نے انگریزوں کے اس کیمپ کو تو تباہ کر دیا لیکن اردو بازار باقی رہا۔ یاد رہے کہ اس وقت اکثریت کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ فوجی کیمپ تباہ ہو گیا لیکن اردو بازار کا نام باقی رہا۔ بعد میں یہاں پر کتابوں کی دکانیں بننا شروع ہو گی۔ اب یہ ایک بہت بڑی کتابوں کی مارکیٹ ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ لیکن اکثر لوگ اوپر بیان کی گئی بات سے متفق ہیں۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو بازار دلی، ہمارے اردو بازار لاہور سے سو گنا سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ میرا گمان ہے کہ اسی بازار کی نسبت سے پاکستان میں لاہور، کراچی اور راولپنڈی میں بھی اردو بازار بنائے گئے۔

میں کتابوں کو دور سے ہی دیکھتا ہوا گزر رہا تھا کہ مجھے اپنے بائیں طرف مگوں پبلشرز کے نام سے ایک بڑی دکان نظر آئی۔ آپ کو علم ہو گا کہ پنجاب کے ایک شہر چنیوٹ میں مگو نام کی بہت ہی معزز کاروباری برادری ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ لوگ

بھی اسی برادری سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ میں اُسی حوالے سے ان کی دکان پر چلا گیا۔ میں نے دکان میں بیٹھے ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کے مالک کہاں بیٹھے ہیں؟ اُس نے بتایا کہ وہ نیچے تہہ خانے میں ہیں اور ان کا نام آنند ہے۔ میں تہہ خانے میں گیا تو ایک تیس پینتیس سالہ نوجوان آنند سے ملاقات ہوئی۔ وہ حسب معمول کاروباری افراد کی طرح اپنے کام میں مصروف تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا اور اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ میں لاہور سے آیا ہوں۔

جب میں نے لاہور کا نام لیا تو انھوں نے اپنے سامنے پڑے کاغذ ہٹا دیے اور میری طرف پھر سے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ ہمارے پنجاب کے شہر چنیوٹ میں مگوں برادری کے لوگ رہتے ہیں۔ میرے چند دوستوں کا تعلق بھی اسی برادری سے ہے۔ میں آپ کی دکان پر مگوں کا نام دیکھ کر آیا ہوں۔ مگوں کا لفظ دیکھ کر مجھے یہ خیال گزرا کہ آپ کا تعلق بھی اُسی مگوں برادری سے ہے اور میں کئی مرتبہ چنیوٹ بھی جا چکا ہوں۔ ان کا یہ سننا تھا کہ وہ اٹھ کھڑے ہو گئے اور مجھے گلے لگایا اور ساتھ ہی میز پر پڑے ٹشو پیپر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ایک بغیر بولے کہانی کا آغاز ہو چکا تھا، مجھے بھی ٹشو پیر کی ضرورت محسوس ہوئی!

دونوں کی بھیگی آنکھیں ایک داستان کی ان کہی نشانی تھیں، کچھ تو مشترک تھا!

جس کا مجھے کچھ دیر بعد اندازاہ ہوا۔۔۔ ایک مگوں لٹ لٹا کر چنیوٹ سے آ کر دلی میں بس گیا اور ایک مانگٹ سرہند، مشرقی پنجاب سے لٹ لٹا کر ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچا اور آج پچاس سال بعد دونوں کی اولادیں مل رہی تھیں!

کچھ تو تھا جس کا دکھ مشترک تھا!

پھر میں نے ان سے پوچھا کیا میرا یہ خیال درست ہے کہ آپ بھی چنیوٹ سے تعلق رکھتے ہیں؟ یہ سب سن کر ان صاحب نے پہلے تو حیرانی کا اظہار کیا اور پھر خوش ہوئے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ نے درست سمجھا ہے۔

ہم تقسیم ہند کے وقت چنیوٹ سے یہاں آئے تھے اور ہمارا کتابوں کا کام ہے۔ ہمارے دفاتر اور دکانیں کئی شہروں میں بھی موجود ہیں۔ میں نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے بھی زیادہ بے تکلف ہو گئے اور بہت جلد ہم چنیوٹی لہجے میں پنجابی میں باتیں کرنے لگے۔ یاد رہے کہ چنیوٹ کے لوگ لاہوری لہجے سے مختلف لہجے کی پنجابی بولتے ہیں۔ مجھے بھی یہ لہجہ آتا تھا اس لیے میں نے اسی لہجے کو اپنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر میرے ساتھ باتیں کرنے لگے۔

آنند مگوں کی پیدائش تقسیم ہند کے بعد کی تھی لیکن وہ دن رات اپنے بزرگوں سے چنیوٹ کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اسے جب پتہ چلا کہ میں چنیوٹ بھی گیا ہوں، تو وہ بہت خوش ہوا۔ وہ مجھ سے چنیوٹ کی ایک ایک بات پوچھنے لگا۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا کہ کاش میرے پاپا آج زندہ ہوتے تو میں آپ کی ان سے ملاقات کرواتا، یقیناً وہ بہت خوش ہوتے۔

میں نے اس سے نقل مکانی کی بات پوچھی تو وہ خاموش ہو گیا اور دیر تک خاموش رہا۔ اس کے بعد وہ بولے کہ یہ ایک ایسی بات ہے جسے ہم جب بھی یاد کرتے ہیں رو پڑتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ پاکستان جانے والے مسلمانوں کے ساتھ یہاں کے مقامی لوگوں نے نے بہت برا سلوک کیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے ساتھ بھی وہاں پر اچھا سلوک نہیں ہوا۔ ہم نے بہت نقصان اٹھایا۔ ہمارے خاندان کے بہت سارے لوگ قتل ہوئے۔

ہم بہت مال و دولت چھوڑ کر خالی ہاتھ بھارت آئے اور بڑی دیر تک پناہ گزینوں کی طرح رہے۔ ہم نہ ہی دلی میں رہنے والے لوگوں کی زبان بولتے تھے اور نہ ہمارا رہن سہن اِن جیسا تھا۔ اس لیے اِن لوگوں سے میل جول قائم کرنے میں ہمیں کافی وقت لگا۔ البتہ ہم مذہب ہونے کی وجہ سے زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ اب ہم سب گھل مل گئے ہیں۔ لیکن ابھی تک ہم اپنے گھروں میں وہی چنیوٹ کے لہجے کی پنجابی میں بات کرتے ہیں اور یہ بات کتنی نسلوں تک چلتی ہے اس کا اندازہ نہیں۔

پاپا نے ہمیں نصیحت کی تھی کہ کوشش کرنا کہ گھر میں پنجابی کے علاوہ کسی اور زبان میں بات نہ کریں تاکہ آپ کا تعلق آپ کے آباؤاجداد سے اور اُس علاقے سے جڑا رہے جہاں سے ہم نقل مکانی کرکے یہاں آئے تھے۔ میں بڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا، اِسی دوران دوپہر کے کھانے کا وقت بھی ہوگیا۔ مجھے انھوں نے اپنے گھر سے آئے ہوئے کھانے میں بھی شریک کیا۔ جب میں اگلی دفعہ بھارت گیا تو دوبارہ ان سے ملنے کے لیے گیا جس پر وہ بہت خوش ہوئے۔

میں آنند سے رخصت لے کر باہر آگیا اور پھر بازار میں پھرنے لگا۔ وہاں میں نے محسوس کیا کہ پاکستان کی نسبت بھارت میں کتابوں کی اشاعت بہت زیادہ ہے۔ ابھی بھی بہت ساری کتابیں بھارت سے پاکستان جاتی ہیں۔ ٹیکسٹائل کے حوالے سے بھی ایک صاحب کی کتابیں پاکستان میں پڑھی جاتی ہیں۔ میں انھی خیالات میں گم اردو بازار سے باہر آگیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اردو بازار میں اسلامی کتابوں کی دکانوں کے مالکان تو مسلمان تھے باقی اکثر دکانوں کے مالکان ہندو تھے۔

اردو بازار کے ساتھ ہی کھانوں کی ایک بڑی مارکیٹ بھی ہے۔ جو گوشت کے پکوانوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ لوگ بڑی تعداد میں یہاں کباب کھانے کے لیے آتے

ہیں۔ اس وقت بھی وہاں پر کافی رش تھا۔ اکثر کھانے کی دکانیں مسلمانوں کی جب کہ کتابوں کی زیادہ تر دکانیں ہندوؤں کی ہیں۔

ہندو کتاب فروش، مسلمان کباب فروش

ایک قوم دماغ کی غذا کا اہتمام کرتی ہیں اور دوسری پیٹ کی غذا کا۔ اس کا ایک قدرتی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک بہترین گاڑی چلاتا ہے دوسرا ابھی تک سائیکل چلا کر اپنا پیٹ پالتا ہے۔

یہ اپنے اپنے اعمال کا فطری نتیجہ ہے،۔

فطرت کبھی کسی کو معاف نہیں کرتی۔

سب کام اپنے اصولوں کے مطابق کرتی ہے۔

جو محنت کرے گا وہی صلہ پائے گا۔

یہ فطرت کا ازلی اصول ہے!

اور اسی پر میرا پختہ یقین ہے اور عمل بھی!

لال قلعہ: مغلوں کے سر کا تاج ، انگریزوں کی عدالت اور مجرم بہادر شاہ ظفر

اردو بازار کے بعد میری اگلی منزل لال قلعہ تھا۔ لال قلعہ دیکھنے سے پہلے میں اس کے قریب سے گزرا تھا اور اس کی وسعت ، بلند و بالا عمارت ، بہترین ڈیزائن اور سرخ رنگ نے مجھے بے حد مرعوب کیا تھا۔ لال قلعے کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے، بادشاہی قلعہ لاہور کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بہت پرانا ہے۔

لال قلعہ جس کا پہلا نام، قلعہ مبارک تھا، کی تعمیر 1638ء میں شاہجہاں نے اُس وقت شروع کی تھی جب اُس نے آگرہ سے دلی اپنا پایہ تخت منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے اپنے ایک نہایت ہی آزمودہ ماہر تعمیرات ،استاد احمد لاہوری کو منتخب کیا۔ استاد احمد لاہوری وہی ہیں جنھوں نے تاج محل بھی ڈیزائن کیا تھا۔ ان کے نام کی وجہ سے ہی قلعے کے مین گیٹ کا نام لاہوری گیٹ ہے۔ تمام لوگ اسی دروازہ سے قلعے میں داخل ہوتے ہیں۔

یہ وہی گیٹ ہے جہاں 15 اگست 1947ء کو ہندوستان کے پہلے وزیراعظم جواہر لعل نہرو نے بھارت کی آزادی کا پرچم لہرایا تھا۔ میں اس قلعے میں دو دفعہ گیا ہوں، ایک مرتبہ دن میں اور دوسری بار مغرب کے بعد۔ دن میں مجھے کسی نے یہ بتایا کہ شام کو یہاں پر ایک بہت ہی دلچسپ پروگرام ہوتا ہے۔ آپ کو اس پروگرام میں ضرور آنا چاہیے۔ میں نے اس پروگرام کی ٹکٹ لی اور پھر رات کو اس پروگرام میں شرکت کی۔ جس کی داستان اگلے صفحات میں بیان کی جائے گی۔

لال قلعہ کا کل رقبہ 255 ایکڑ جب کہ شاہی قلعہ لاہور کا رقبہ 50 ایکڑ ہے۔ اِس قلعہ کی چار دیواری کی لمبائی اڑھائی کلو میٹر کے قریب ہے جبکہ اس کی دیوار کی اونچائی ساٹھ فٹ سے لیکر ایک سو فٹ کے لگ بھگ ہے اور اس کے آٹھ کونے ہیں۔ اس قلعہ کے قابل دید مقامات میں؛ نوبت خانہ، دیوان عام، دیوان خاص، نہر بہشت، ممتاز محل، حمام، باؤلی، موتی مسجد، ہیرا محل اور شہزادوں کی رہائش گاہیں شامل ہیں۔

قلعہ اپنی وسعت اور ڈیزائن کے اعتبار سے ایک قابل دید عمارت ہے۔ اس قلعے اور اس میں بنی ہوئی عمارات کی تفصیل بیان کرنے کے لیے الگ سے ایک کتاب درکار ہے۔ میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ یہ وہ جگہ ہے ،جس نے بہت سے عروج وزوال دیکھے۔ میں اسی لاہوری دروازے سے گزرا اور آگے جا کر مختلف عمارتوں کے سامنے بے

ٹوک پھرتا رہا، جس دروازے سے کبھی شاہجہاں گزرا تھا۔ شاہ جہان کے بعد اس کی اولاد بھی اسی جگہ سے گزرتی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پر نادر شاہ نے تباہی مچائی اور اس کے بعد انگریزوں نے بھی اسے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جنگِ آزادی سے قبل ہی ایک وظیفہ خوار بادشاہ بہادر شاہ ظفر قلعے تک محدود ہو گیا تھا جبکہ قلعے کے باہر ہر جگہ انگریزوں کی حکومت تھی۔

1857ء کی جنگ آزادی شروع ہونے کے بعد، مجاہدین قلعے تک پہنچے اور انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو اپنا سربراہ بنایا۔ پھر مجاہدین نے ان کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کی۔ اس جنگ میں بہادر شاہ کی اولاد بھی شریک ہوئی، بخت خان بھی اسی جنگ میں آیا اور انھوں نے کچھ وقت کے لیے انگریزوں کو شکست بھی دی اور ان کو دلی سے باہر بھی نکال دیا۔ اسی جگہ بیٹھ کر بہادر شاہ ظفر نے قریبی ریاستوں کو بھی شرکتِ اقتدار کے لیے کہا لیکن رب کائنات کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ایک دن بادشاہ اپنی ہی جان بچانے کے لیے اپنے پر دادا، ہمایوں کے مقبرہ پر چلا گیا۔ وہاں پر اس کے پاس دو ہی راستے تھے، یا تو وہ بخت خان کی تجویز پر دلی سے چلا جاتا اور دور بیٹھ کر اس جنگ کی قیادت کرتا، یا پھر وہ انگریزوں کی اِس شرط کو منظور کرتا کہ اگر وہ اپنے آپ کو سرنڈر کر دے تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔ بادشاہ سلامت نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

پھر اسی قلعے میں جسے اس کے بزرگوں نے بنایا تھا، بادشاہ کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلا۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ باغی کی سزا تو موت کی بنتی ہے۔ سزا دینا یا نہ دینا حکومت کا کام ہے۔ انگریز پہلے ہی ان کی جان بخشی کا وعدہ کر چکے تھے لیکن وہ ان کو دلی کے آس پاس بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھیں وہاں سے پانچ ہزار میل دور برما کے

ایک شہر رنگون بھیج دیا۔ جہاں انھوں نے ایک معمولی سے مکان میں اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کیے۔ رنگون میں ہی ان کی وفات ہوئی۔

مجھے ان کے مقبرہ پر جانے کا موقع ملا ہے۔ رنگون کے مسلمانوں نے ان کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا ہے اور مقبرہ کے ساتھ ہی ایک مسجد بھی بنائی ہے۔ اس وقت ان کی قبر کو ایک درگاہ کا مقام حاصل ہے۔ اب لوگ ان کو ایک عظیم صوفی سمجھتے ہیں اور ان کے مزار پر سالانہ عرس کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

میں قلعے کی دیواروں پر یہ سب کچھ پڑھ رہا تھا۔ میں بہت دیر تک قلعے کے مختلف حصوں میں گھومتا رہا۔

مجھے ہر جگہ عروج و زوال کی داستان کے سوا کچھ نظر نہ آیا، باقی عمارت تو عمارت ہے اس میں لال پتھر لگا ہوا ہے۔ یہ بہت وسیع ہے اِس میں خوبصورت باغ ہیں، یہاں باغیچے ہیں اور تو سب کچھ ہے لیکن اس کی اصل پہچان تو مغلیہ حکومت کا پایہ تخت ہونا تھا۔

مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ جو اقبال نے کہا تھا:

شمشیر و سناں اول طاؤس رباب آخر

لیکن جب طاؤس رباب اول اور شمشیر و سناں آخر ہو جائے تو پھر کوئی لال قلعہ کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔

قلعے کا کام پناہ دینا ہے، اس میں کون پناہ لیتا ہے اس کا انحصار صرف ہمت مرداں پر ہے۔ یہ عمارت تو کسی کو خود اپنے اندر آنے سے نہیں روک سکتی، اس میں تو وہی آئے گا جس میں اندر آنے کی ہمت اور حوصلہ ہو گا۔

مغلوں کے آخری پایہ تخت دلی کو انگریزوں نے فوجی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا اور ہر چیز پر قبضہ کر لیا، بادشاہ کی خواب گاہ، بیگمات کے کمرے، باغ، زیورات الغرض ہر چیز ان کے قبضہ میں آ گئی اور بادشاہ سلامت، ان کی بیگم کو چند افراد کے ساتھ ایک بیل گاڑی پر بٹھا کر انھوں نے اسی لال قلعے سے پانچ ہزار میل دور بھجوا دیا تھا۔

پھر ایک دن آیا، جب ہندوستان کے لوگوں نے انگریز کو بھی چلتا کیا اور پھر اسی قلعے پر بھارت کا پرچم لہرایا گیا۔ آج اس قلعے کے لاہوری گیٹ پر بھارت کا پرچم لہرا رہا ہے اور ہر سال یوم آزادی کی تقریب اسی قلعے میں منائی جاتی ہے۔ انھی خیالات میں گم میں بہت دیر تک قلعے میں رہا اور پھر واپس آ گیا۔ دوسری مرتبہ میں مغرب کے بعد اس قلعے میں ہونے والے پروگرام میں شرکت کے لیے گیا جس کی کسی نے بہت تعریف کی تھی۔

اس پروگرام میں شرکت کے بعد مجھے سمجھ آ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس قلعے کے مالکوں کو کیوں بدلا اور کیوں نئے مالک آئے تھے اور کیسے یہ قلعہ مغل ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس پروگرام کی مختصر رُوداد پیش خدمت ہے۔

ایک شام قلعہ میں بادشاہ سلامت کے ساتھ

اس پروگرام کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ مغرب کے بعد قلعے کے ایک لان میں تقریباً دو سو کے قریب کرسیاں لگ جاتی ہیں اور لوگ ان کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ مکمل اندھیرا تو نہیں ہوتا لیکن روشنی بہت کم ہوتی ہے۔ اتنے میں کچھ آوازیں آنا شروع ہوتی ہیں۔ جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ قلعہ مبارک کی خواتین کی آوازیں ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خواتین قلعے کے قریب کسی مارکیٹ سے خریداری کر رہی ہیں، صرف آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن اتنی خوبصورت آواز اور اتنا خوبصورت تلفظ شاید ہی

کبھی دوبارہ سننے کو ملے۔ کچھ دیر تک تو خواتین کی آوازیں آتی ہیں اور پھر آوازوں سے محسوس ہونے لگتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر دربار میں تشریف لا رہے ہیں۔ زور دار اور بلند آواز کے ساتھ بہادر شاہ ظفر تشریف لا رہے ہیں کی صدا بلند ہوتی ہے۔ ان کے نام کے ساتھ بے شمار القابات لگائے جاتے ہیں۔ ان کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور پھر بادشاہ سلامت تخت شاہی پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔

دربار سجتا ہے اور بادشاہ کے دربار میں شعرا حضرات اپنا کلام پیش کرتے ہیں، واہ واہ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ شعراء میں مرزا غالب، استاد ذوق نمایاں ہوتے ہیں البتہ ان کے علاوہ بھی کئی اور شاعر موجود ہوتے ہیں۔ سب لوگ فرداً فرداً شعر پڑھتے ہیں اور واہ واہ کا شور مچتا ہے اور باتوں ہی باتوں میں ساری دنیا ادھر سے ادھر کر دی جاتی ہے۔

بڑی دیر تک محفل چلتی ہے اور اس کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سب کو کھانا کھلایا جا رہا ہے، انعام و اکرام دیے جاتے ہیں اور پھر کہیں جا کر یہ محفل برخواست ہوتی ہے۔ یہ قلعہ کے اندرونی حالات کی کہانی ہوتی ہے۔

یہ پروگرام ایک گھنٹہ سے زائد چلتا رہتا ہے۔ اس پروگرام نے مجھ پر سحر طاری کر دیا اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میں اُس دور میں جا کر یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اس پروگرام کی ریکارڈنگ حاصل کرنے کی کوشش کی جو مجھے نہ مل سکی۔ بہر حال وہ ایک دلچسپ تجربہ تھا جس کی گونج آج تک سنائی دیتی ہے۔

میرے دل میں یہ خیال ابھرا کہ ایک وقت تھا کہ جب جنگجو لوگ اس قلعہ میں بیٹھ کر پورے ہندوستان پر حکومت کرتے تھے اور وہ اُس وقت بادشاہ کے درباری ہوتے تھے۔ لیکن جب بادشاہ سلامت کا وقت شاعروں کی محفل میں گزرے گا تو آپ خود اندازہ کریں کہ پھر کون ہے جو اس وسیع سلطنت کی حفاظت کرے گا؟

جب ایسی صورت حال ہو تو پھر اللہ تعالیٰ بھی حکمرانوں کو بدل دیتا ہے اور جو وہ کچھ کرنا جانتے ہیں ان کو اپنی زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔ جو صرف شعر و شاعری پہ زندہ رہتے ہیں انھیں رنگوں جانا پڑتا ہے، ان کے بچوں کو ان کے سامنے قتل کیا جاتا ہے اور ذلت کی انتہا یہ کہ بچوں کے سر باپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

اس کی مزید تفصیل میں جانا میرے لیے ممکن نہیں، اس کے لیے آپ کو تاریخ پڑھنی چاہیے یا کم از کم کبھی موقع ملے تو لال قلعہ دہلی تو دیکھنا ہی چاہیے۔ اس طرح سے میری آج کے دن کی سیر مکمل ہوئی اور میں واپس اپنے میزبان کے آفس پہنچ گیا اسی شام کو میرے ایک دوست مجھے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئے۔ جس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔



Lal Qila Dehli Photo Credit: https://www.viator.com

کریم ریستوران: دہلی کی ایک روایت کا تسلسل

انیس سو پچانوے میں مجھے ترکی جانے کا موقع ملا ایک روز میں اور ڈاکٹر سلیمان وہرہ صاحب ایک ہوٹل کی لابی میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب سیڑھیاں اتر کر ہمارے پاس آئے۔ شکل وصورت سے لگ رہا تھا کہ ان کا تعلق بھارت یا پاکستان سے ہے۔ وہ ہمارے پاس آئے اور انھوں نے ہم سے پوچھا کہ کیا آپ پاکستان سے ہیں؟ ہم نے کہا کہ جی ہاں ہمارا تعلق پاکستان سے ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میرا نام رنبیر سنگھ مانگٹ ہے اور میرا تعلق بھارت سے ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ وہ اس وقت مشرقی یورپ سے آرہے ہیں اور بوڈاپیسٹ میں کسی نے ان کا بریف کیس چرالیا تھا جس میں پاسپورٹ اور رقم تھی جس کی وجہ سے انھیں خاصی پریشانی ہوئی۔ اب گروکی کِرپا سے بھارت کی ایمبیسی نے نیا پاسپورٹ بنا کر دے دیا ہے اور یوں وہ سفر کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ ہم نے اس واقعے پر ان کے ساتھ افسوس کا اظہار کیا اور مانگٹ ہونے کی وجہ سے ہماری دوستی کا آغاز ہونے میں کچھ بھی دیر نہ لگی۔ ان کے آباؤاجداد لدھیانہ کے رہنے والے تھے لیکن اب وہ دہلی میں رہتے ہیں۔ وہ پیپر انڈسٹری میں استعمال ہونے والے کیمیکلز بنانے والی ایک انٹر نیشنل کمپنی میں سینئر مینجر تھے۔ ان سے پہلی ملاقات کو آج 25 سال ہوگئے ہیں لیکن ابھی تک ان کے ساتھ ہمارا گہرا تعلق موجود ہے۔ میں جب بھی بھارت گیا تو ان سے میری ملاقات ضرور ہوئی ہے اور وہ بھی جب کبھی لاہور آئے تو ہمیں میزبانی کا شرف بخشا ہے۔

میں نے بھارت جا کر ان سے رابطہ قائم کیا تو ان کے ساتھ یہ طے ہوا کہ آج شام کا کھانا ہم اکٹھے کھائیں گے۔ وہ شام کو مجھے ہوٹل سے لینے آگئے اور کہنے لگے کہ آج آپ کو ایک بڑے ہی معروف ریسٹورنٹ میں کھانا کھلاؤں گا۔ ہم ریسٹورنٹ پہنچے تو پتہ

چلا کہ اس ریسٹورنٹ کا نام کریم ریسٹورنٹ ہے۔ وہ ایک بہت ہی روایتی ریسٹورنٹ تھا جسکی ایک بڑی پارکنگ تھی جو دہلی جیسے شہر میں بہت کم ہوتی ہے اور سجاوٹ بھی بے حد خوبصورت تھی۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ تمام سٹاف سرخ رنگ کی لمبی اچکن پہنے ہوئے تھے ۔ جس سے میرا پہلا تاثر یہ بنا کہ یہ کوئی بہت ہی مقامی روایات کا حامل ریسٹورنٹ ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر تھا کہ یہ کسی مسلمان کا ہوٹل ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو یہ بتاؤں کہ ہم نے کیا کھایا، میں چاہوں گا کہ ریسٹورنٹ کے متعلق کچھ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

کہتے ہیں کہ انیسویں صدی میں، مغلوں کے آخری دور میں، محمد عزیز نامی ایک شخص مغل بادشاہ کے شاہی باورچی خانے کا سربراہ تھا۔ جہاں مغل گئے وہاں ان کے شاہی باورچی خانے بھی چلے گئے۔ محمد عزیز بھی دلی چھوڑ کر میرٹھ چلا گیا اور وہیں اس کی وفات ہوئی۔ وفات سے پہلے اس نے کھانا پکانے کا فن اپنے خاندان کے چند لوگوں کو سکھا یا جن میں حاجی عبدالکریم بھی تھے۔

انگریزوں نے اپنے دورحکومت میں 1911ء میں دہلی میں ایک بہت بڑا دربار لگایا۔ جس میں انگلینڈ کا بادشاہ جارج پنجم مہمان خصوصی تھا۔ اس وقت پورے ہندوستان سے راجے، مہاراجے اور ان کے بے شمار دوست احباب بھی دلی آئے۔ حاجی کریم الدین نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ میرٹھ سے دلی آگیا اور یہاں آ کر اپنا ریسٹورنٹ کھولا جس کا نام کریم ہوٹل رکھا۔اس نے یہ طے کیا کہ وہ بہت ہی کم ریٹ پر لوگوں کو شاہی کھانا کھلائے گا۔اس نے ایسا ہی کیا اور وہ کامیاب ٹھہرا۔ آج کریم ہوٹل کی بہت سی برانچیں ہیں جن میں سب سے پرانی برانچ جامع مسجد کے پاس ہے۔ یہ ہوٹل دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کے رزق میں بے حد برکت عطا

فرمائے۔ آمین ! اس وقت کریم صاحب کی چوتھی نسل یہ کام کر رہی ہے اور بہت ہی خوب کر رہی ہے۔

جب ہم اندر گئے تو رنبیر سنگھ مانگٹ صاحب نے کہا کہ ان کی ایک بہت ہی اسپیشل ڈش ہے جسے مکھنی دال کہتے ہیں۔ مسور کی ثابت دال جو قدرتی طور پر سیاہ رنگ کی ہوتی ہے، کو خاص طریقے سے پکاتے ہیں ہیں اور اسے مکھن کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

شاید یہیں سے یہ محاورہ بنا ہو گا۔

یہ منہ اور مسور کی دال !

ہمارے بچپن میں ہمارے گھروں میں یہ معروف ترین کھانا ہوا کرتا تھا, اس لیے کہ یہ سستا پڑتا تھا۔ دال بھی مہنگی نہیں ہوتی تھی اور مکھن تو گھر میں ہی بنایا جاتا تھا۔ مجھے یہ کھاتے ہوئے وہ سب کچھ یاد آیا کہ کس طرح ہماری والدہ یہ دال بناتی تھیں۔

بہر حال کریم ہوٹل کا انداز دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ ہوٹل بھی چلا رہے ہیں اور انھوں نے اپنے کلچر کو بھی نہیں چھوڑا۔ وہ سب لوگ انتہائی خوبصورت انداز میں اردو بول رہے تھے اور بہت ہی مؤدبانہ طریقے سے اپنے مہمانوں کی خدمت کر رہے تھے ۔اتنی خاموشی تھی کہ لگتا تھا یہاں کوئی نہیں ہے۔ درودیوار بھی ایک روایتی انداز سے سجائے ہوئے تھے۔ جو کھانا جو مقدر میں تھا وہ کھالیا۔ لیکن وہ منظر اب بھی یاد ہے۔جب بھی اب کبھی بھارت جانا ہوا تو ان شاء اللہ حاجی کریم الدین کے لگائے ہوئے اس پودے سے ضرور فیض یاب ہو ں گا۔ اس طرح سے میرا دوسرا دن بھی بخیر و عافیت گزر گیا۔ رنبیر سنگھ مانگٹ صاحب نے مجھے ہوٹل اتارا اور میں یہ سوچ کر سو گیا کہ صبح چھ بجے خفیہ ایجنسی کا میرا دوست رام لال ملنے آئے گا اور میں اس سے پوچھوں گا کہ اس کی پتنی کا کیا حال ہے کیونکہ اس نے کل بتایا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

درشن چوہدری عرف بیرا

اگلے روز رام لال کے جانے کے بعد تقریباً دس بجے شرما صاحب تشریف لے آئے۔ آج پروگرام کے مطابق مجھے ان کی ڈائیز بنانے والی فیکٹری میں جانا تھا کیونکہ میں ان سے ڈائیز خریدنا چاہتا تھا۔ شرما صاحب نے بتایا کہ ہم یہاں سے دفتر چلیں گے اور پھر دفتر سے بیرا جی آپ کو ڈائیز بنانے والی فیکٹری میں لے کر جائیں گے۔ بیرا جی کا لفظ سن کر میں ایک دفعہ تو چونک گیا کیونکہ یہ لفظ ہمارے گھر میں بڑے بھائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

میرے والد محترم اپنے بھائیوں اور کزنز میں سب سے بڑے تھے، اس لیے سب لوگ انھیں بیرا کہتے تھے۔ ویر بھی بھائی کے لیے بولا جاتا ہے اور بیرا کا مطلب بھی بڑا بھائی ہی ہے۔ مجھے بھی میرے کزن اور بھائی، بیرا ہی کہتے رہے ہیں۔ اب ایک دو کے علاوہ باقی سب نے بھائی جان کے لفظ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ یہ ہماری پنجابی زبان پر اردو کے اثرات کی ایک نشانی ہے۔ لیکن بھارت میں ایسا نہیں ہے، پنجابی بولنے والے لوگ ابھی بھی اپنی زبان کے ساتھ بڑے اچھے طریقہ سے جڑے ہوئے ہیں۔ میں نے شرما صاحب کو بتایا ہے کہ یہ لفظ ہمارے گھر میں بھی بڑے بھائی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ درشن چوہدری صاحب جو اس کمپنی کے مالک ہیں ان کو بھی ان کے بھائی بڑے ہونے کی وجہ سے بیرا کہتے ہیں۔ شرما صاحب نے کہا آپ نے ٹھیک سمجھا۔ انھوں نے بتایا دہلی میں یہ لفظ نہیں بولا جاتا لیکن پنجاب کے کچھ علاقوں میں بڑے بھائی کے لیے بیرا کا لفظ اب بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سے میرا بیرا جی کو ملنے کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔

ہم اندرون دلی اُن کے دفتر چلے گئے جہاں بیرا جی تشریف فرما تھے۔ درمیانے قد کا ایک پچاس سالہ شخص جو طبیعت کے لحاظ سے نہایت ہی بردبار تھا۔ ان کی باتوں سے

یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے کاروبار کو بہت اچھے طریقے سے سمجھتے ہیں اور اپنے خاندان کو بھی مناسب انداز میں ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ وہ مجھے لے کر اپنی فیکٹری چلے گئے جو دہلی سے خاصے فاصلے پر تھی۔ راستے میں مجھے ان سے بہت سی باتیں کرنے کا موقع ملا۔ ہم ڈائیز بنانے والی فیکٹری میں بیٹھے تھے کہ وہاں پر ایک انتہائی دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

ہماری موجودگی میں ایک صاحب سکوٹر پر آئے، انھوں نے بیرا جی کو سلام کیا اور میرے ساتھ بھی ہاتھ ملایا۔ بیرا جی نے پوچھا کہ آپ جس کام سے گئے تھے کیا وہ کام ہو گیا ہے؟ اس پر اس صاحب نے کہا جی ہو گیا ہے۔ اس پر دونوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے تھا لیکن ماحول ایسا بن گیا اور بیرا جی سے میری بے تکلفی بھی کام آ گئی۔

میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ ہمیں سرکار سے ایک سرٹیفیکیٹ چاہیے تھا۔ جس کے لیے ہم نے ایک سرکاری دفتر میں درخواست دے رکھی تھی۔ وہاں پر ایک صاحب تھے جو اس کام کے تیس ہزار روپے مانگ رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہا کہ یہ زیادہ ہیں تو انھوں نے بہت ہی دلچسپ جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ میرا اپکا ریٹ ہے اور میں اپنا ریٹ خراب نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے بتایا کہ میں دو ماہ بعد یہاں سے ریٹائر ہو رہا ہوں، اس کے بعد جو صاحب آئیں گے ان کا ریٹ بیس ہزار روپیہ ہے، آپ انتظار کریں اور دو ماہ کے بعد آپ اپنا کام کروالیں۔

بیرا جی نے بتایا کہ نئے صاحب آ گئے اور انھوں نے بیس ہزار روپے لے کر ہمیں سرٹیفیکیٹ دے دیا ہے۔ میں نے بیرا جی سے کہا کہ لگتا ہے کہ رشوت کا رواج عام ہے اور اس میں کسی کو کسی طرح کا کوئی خوف بھی نہیں ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ ہاں آپ کی بات درست ہے۔ ہم اگر یہ چھوٹی چھوٹی رقمیں نہ دیں تو ایک دن بھی کام

نہیں کر سکتے۔ میں نے دل میں سوچا کہ ہمارے ہاں بھی معاملات کچھ ایسے ہی ہیں۔ فرق شاید صرف ریٹ کا ہو۔ دوپہر کے بعد ہم ان کی فیکٹری سے واپس اندرون دلی آ گئے۔ آج پھر میں نے ان سے رخصت لی اور اندرون دلی کے جو مقامات دیکھنے باقی تھے ان کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

فتح پوری مسجد

میں بیراجی کے دفتر سے نکل کر چاندنی چوک کے پاس پہنچ گیا۔ میں سب سے پہلے فتح پوری مسجد دیکھنا چاہ رہا تھا، جس کے متعلق یہ سنا تھا کہ یہ مسجد بہت وسیع تو نہیں لیکن بہت ہی خوبصورت ہے اور مغل فن تعمیر کا ایک نہایت ہی خوبصورت شاہکار ہے۔

چاندنی چوک کے مغرب میں واقع فتح پوری مسجد سترویں صدی کے وسط میں تعمیر کی گئی تھی۔ اس کا نام شاہ جہاں کی ایک بیوی فتح پوری بیگم کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ مسجد مکمل طور پر سرخ پتھر سے بنی ہوئی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ آزادی کے مجاہدین نے قیام کیا تھا۔ انگریزوں نے اس مسجد کو بھی نہ بخشا اور اسے ایک مقامی تاجر کو فروخت کر دیا تھا۔

اس مسجد کو دیکھنے کے بعد میں اس بات کا قائل ہو گیا کہ شاہ جہاں میں قدرتی طور پر ایک فن تعمیر کا ماہر چھپا ہوا تھا اور اس سلسلہ میں اس کے اہل خانہ بھی کسی سے کم نہ تھے۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ چاندنی چوک اس کی بیٹی نے ڈیزائن کیا تھا اور یہ مسجد اس کی بیوی نے بنوائی تھی۔ جنگ آزادی میں اس مسجد کا کردار بے حد اہم رہا تھا۔ میں یہ سوچتا ہوا وہاں سے واپس آ گیا کہ بلاآخر اللہ تعالیٰ کے گھر میں ہی لوگوں کو پناہ ملی۔

گردوارہ سیس گنج صاحب: گرو تیغ بہادر سنگھ کی جائے قتل

مجھے یاد ہے کہ پہلی مرتبہ میں دورِ طالب علمی میں ننکانہ صاحب میں موجود سکھوں کے گردوارے گیا تھا۔اس کے علاوہ مجھے حسن ابدال میں واقع پنجہ صاحب اور شیخوپورہ کے قریب گردوارہ سچا سودا میں بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ چاندنی چوک کی سنہری مسجد کے قریب ایک تاریخی گردوارہ موجود ہے جس کا نام سیس گنج گردوارہ ہے۔ میری اگلی منزل یہی گردوارہ تھا۔ بھارت میں کسی بھی گردوارے میں جانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں آپ کو گرودوارہ سیس گنج صاحب کے متعلق کوئی بات بتاؤں، میں آپ کو یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ تاریخی کتب خاص طور پر سکھوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اورنگزیب اور اور سکھوں کے درمیان شدید کشمکش پائی جاتی تھی۔اسی کشمکش کے نتیجے میں اورنگزیب نے بہت سے سکھوں کو قتل کیا۔ ان میں سے ایک قتل سکھوں کے نویں گرو، گرو تیغ بہادر کا بھی ہے، جس کا سکھوں کو سب سے زیادہ دکھ ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ مجھے بھارتی پنجاب کے شہر سرہند میں اس گردوارے جانے کا بھی اتفاق ہوا ہے جہاں پر گرو گوبند صاحب کے بچوں کو دیوار میں زندہ چنوایا گیا تھا۔ یہ بات بہت حد تک سچ ہے، سکھ اس بات کا بڑے زور و شور سے دعویٰ کرتے ہیں کہ مغل بادشاہ نے یہ جرم کیا تھا۔ میں جب آپ کو پنجاب کی سیاحت کے بارے میں بتاؤں گا تو اس وقت سرہند میں واقع اس گردوارے کا ذکر بھی آپ کے سامنے رکھوں گا۔

میں پیدل چلتا ہوا سیس گنج گردوارہ پہنچ گیا۔ایک بڑی تعداد میں وہاں لوگ موجود تھے اور ایک خاص پروٹوکول کے تحت لوگ گردوارے کے درمیان میں واقع ہال

کی طرف جا رہے تھے۔ جب سب لوگ کوئی ایک کام کر رہے ہوں تو آپ کو کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہاں سب سے پہلا کام ایک واش بیسن پر ہاتھ اور منہ دھونا ہوتا ہے، اس کے بعد صاف پانی کی ایک چھوٹی نالی چل رہی ہوتی ہے جس میں پا ؤں دھوئے جاتے ہیں۔ ہاں یاد آیا ایک جگہ جس کا نام جوڑا گھر ہے، وہاں پر آپ کو اپنے جوتے بھی جمع کروانے ہوتے ہیں اور جرابیں بھی اتارنی ہوتی ہے۔

ہر گردوارہ میں جوڑا گھر کی روایت بڑی دلچسپ ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں پر کام کرنے والے افراد، گردوارہ میں آنے والوں کے جوتے لے کر ریکس میں رکھتے ہیں اور ایک ٹوکن دے دیتے ہیں۔ میں نے جوڑا گھر میں دیکھا کہ ایک آدمی، جو شکل و صورت سے خاصہ پڑھا لکھا اور خوشحال لگ رہا تھا، وہ بھی وہاں پر لوگوں کے جوتے پکڑ کر رکھ رہا تھا۔ جبکہ ہمارے ہاں تاریخی مقامات کے باہر یہ کام عام سے لوگ کرتے ہیں اور ہم ان کو اس کام کی ادائیگی بھی کرتے ہیں۔ مجھے کچھ عجیب لگا۔ میں نے ایک صاحب سے اس بارے میں پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ اس نے مجھے بتایا کہ سکھ لوگ جوڑا گھر میں کام کرنے اور لوگوں کی خدمت کرنے کی منت مانتے ہیں۔ اس سے ان کے نفس کی تربیت ہوتی ہے اور اس سب کچھ کرنے کا مقصد اپنے اندر سے غرور یا تکبر کو ختم کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہ ہمارے بابا گرو نانک کی تعلیم ہے۔

اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ جو صاحب سفید کپڑوں میں لوگوں کے گندے جوتے پکڑ کر رکھ رہے ہیں وہ ایک بہت بڑے سیٹھ ہیں۔ انھوں نے دس دن کے لیے جوڑا گھر کی خدمت کرنے کی منت مانی ہوئی ہے۔ یہ بھی تزکیہ نفس کا ایک انداز ہے۔ میں اس پروٹوکول سے گزر کر اندر ہال میں چلا گیا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے دوسرا اہم کام سر پر رومال رکھنا ہوتا ہے۔ میں نے بھی وہاں پر پڑے ہوئے ریشمی رومالوں میں سے ایک رومال لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

ایک بہت بڑے ہال کے درمیان اونچے چبوترے پر ایک سکھ گرنتھ صاحب جو کہ سکھوں کے نزدیک سب سے مقدس کتاب پڑھ رہے تھے اور باقی لوگ ارد گرد بیٹھے سن رہے تھے۔ کچھ لوگ گرنتھ صاحب کو پنکھا بھی جھل رہے تھے۔ میں نے ایک سردار سے پوچھا کہ کتاب کو پنکھا جھلنے کا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے بتایا کہ ہم کتاب کو اپنا زندہ گرو سمجھتے ہیں اور اس کا اسی طرح احترام کرتے ہیں جیسے زندہ گرو کا احترام کیا جاتا ہے اور اسی طریقے سے اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں جس طرح سے ایک انسانی جسم کی حفاظت کی جاتی ہے۔

میں کچھ دیر گردوارہ ہی میں رہا، جہاں مجھے دو بے حد دلچسپ چیزیں نظر آئیں ۔ ایک تو یہ کہ سب لوگ خاموش بیٹھے تھے اور صرف گرنتھ صاحب پڑھنے والوں کی آواز سنائی دیتی ہے اور لوگ آپس میں کوئی بات چیت نہیں کر رہے تھے۔ یہ ایک طرح سے گرنتھ صاحب کے احترام کا طریقہ ہے۔ دوسرا یہ کہ وہاں پر بڑے پیانے پر کھانے کا بندوبست تھا۔ دال روٹی کے ساتھ ساتھ حلوہ بھی تھا جسے وہ پرشاد کہتے ہیں۔

ایک سردار نے بتایا کہ دنیا بھر میں موجود گردواروں میں ایسا ہی کھانا پکتا ہے اور ہر وقت دستیاب بھی ہوتا ہے۔ یہ ہمارے گرو کا حکم ہے کہ جو بھی گردوارہ میں آئے اِسے ہر حالت میں کھانا ملنا چاہیے۔

میں نے ایک بات نوٹ کی ہے کہ سکھوں کے علاوہ ، ہندوؤں کی عبادت گاہوں اور اکثر مسلمان بزرگوں کے مزارات پر دال اور سبزی ہی پکائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کوئی ایسا شخص جو گوشت نہ کھاتا ہو وہ بھوکا نہ رہے۔ مسلمان مزارات میں داتا صاحب اور حضرت نظام الدین اولیاء کا میں عینی شاہد ہوں۔

اس وقت سی ڈی کا رواج نہیں تھا بلکہ ٹیپ ریکارڈر کی کیسٹس ملتی تھی۔ میں نے گردوارے کے باہر سے چند کیسٹس خریدیں، جو بہت ہی سادہ پنجابی زبان میں وعظ و

نصیحت پر مبنی تھیں۔ میں ان کو خاصے عرصہ تک اہتمام کے ساتھ سنتا رہا۔ اس کے علاوہ میں نے وہاں سے ایک کڑا بھی خریدا جو میں پاکستان آکر پہنتا بھی رہا۔ کچھ اہلِ ایمان نے اسے سکھوں کی نشانی سمجھ اس پر اعتراض کیا اور میرے ایمان کے اوپر بھی شک شروع کر دیا۔ کچھ نے کہا کہ کیونکہ تمہارے آباؤاجداد سکھ تھے، اس لیے تم یہ کڑا پہن رہے ہو۔ میں نے اپنے ایمان کو کڑے پر ترجیح دی اور ایک دن کڑا اتار دیا۔

گردوارے کی سیر کے بعد میں باہر نکل آیا اور ایک تھڑے پر بیٹھ کر میں نے اس گردوارہ کی تاریخ کو جاننا چاہا جو گردوارہ کے پاس سے لی ہوئی ایک کتاب میں درج تھی۔ اُس کتاب کے مطابق اس جگہ پر 1675ء میں گرو تیغ بہادر کو قتل کیا گیا تھا۔ قتل سے پہلے گردوارہ سے ملحقہ کوتوالی میں انھیں قید بھی رکھا گیا تھا۔

اورنگ زیب کی فوج نے گرو کا قتل کر دیا لیکن لاش کے بارے میں وہ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ اس دوران رات بھی ہو گئی۔ سکھوں کو خیال آیا کہ کہیں ان کے گرو کی لاش کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ ہو جائے۔ اسی خوف سے گرو کے ایک ساتھی نے گرو کی لاش کو رات کے وقت اٹھایا اور اپنے گھر میں رکھ لیا۔ یاد رہے کی سکھ مردوں کو جلاتے ہیں۔ اس شخص نے ان کی میت کو جلانے کے لیے اپنا پورے کا پورا گھر جلا دیا۔ لاش کو کسی متوقع توہین سے بچانے کے لیے یہ قدم اٹھایا گیا۔ اس بناء پر سکھ ایسا کرنے والے سکھ کی بے حد قدر کرتے ہیں۔

جب مغلوں کی حکومت کمزور پڑ گئی تو ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سکھوں نے دلی پر حملہ کیا اور انھوں نے اُس جگہ پر جہاں گرو صاحب کو قتل کیا گیا تھا ایک گردوارہ بنانے کا مطالبہ کیا۔ مغلوں نے انھیں اس بات کی اجازت دے دی اور اس طرح یہ گردوارہ 1783ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس گردوارہ کی تعمیر کا سہرا سکھوں کے ایک جرنیل بگھیل سنگھ کو جاتا ہے۔ بعد میں مسلمانوں نے اس جگہ پر ایک مسجد بھی بنائی اور اس طرح یہ جگہ

ایک جھگڑے کا باعث بھی بنی رہی۔ انگریزوں کے دور میں اس جگہ کا فیصلہ سکھوں کے حق میں ہو گیا۔ گرو کے قتل کی وجہ سے سکھ اس جگہ کا بے حد احترام کرتے ہیں۔

میں جب بھی تاریخ پڑھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ تاریخ پڑھنے کے لیے بہت زیادہ حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنے طے شدہ نظریات اور احساسات کے ساتھ تاریخ کو پڑھیں گے تو آپ کو تاریخ پڑھنے کا مزا نہیں آئے گا اور نہ ہی آپ کبھی سچ جان سکیں گے۔ آپ صرف اپنے ہی نظریات کو پڑھ رہے ہو گے لیکن اگر آپ غیر جانبدار ہو کر تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اپنوں اور غیروں کے کردار کا صحیح معنوں میں اندازہ ہو گا۔

میرے بزرگ بتایا کرتے تھے کہ تقسیم ہند کے وقت جب سکھ مسلمانوں کو مارتے تھے تو ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ اورنگزیب کے مظالم کا بدلہ ہے۔ انھی خیالات اور سوچوں کے ساتھ میں وہاں سے اپنی اگلی منزل کی طرف چل پڑا۔



Gurdawar Sis Old Dehli Photo Credit:
https://www.mapsofindia.com

دلی کے بازار: دلی کی ثقافت کی ایک زندہ مثال

میری اگلی منزل دلی کے بازار تھے اور کسی ریسٹورنٹ سے کھانا کھانا تھا۔ اس دوران جو چند چیزیں میں نے محسوس کی وہ آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جو جگہیں میں دیکھنا چاہتا تھا وہ کچھ فاصلے پر تھیں۔ اس لیے میں نے ایک آدھ مرتبہ سائیکل رکشہ بھی استعمال کیا۔

دلی کے بازاروں میں پھرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ مسلمان ایک خاص علاقے تک محدود ہیں۔ ان علاقوں میں غیر مسلموں کی تعداد خاصی کم نظر آتی تھی۔ ویسے تو پہچان مشکل ہوتی ہے لیکن سکھ اپنی پگڑی اور ہندو اپنے ہاتھ پر بندھے ہوئے دھاگے یا ماتھے پر لگے ہوئے تشکہ سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ دکان کی بھی یہی پہچان ہے۔ ہر شخص نے اپنی دوکان پر کوئی نہ کوئی مذہبی نشاں ضرور لگایا ہوتا ہے۔ حال ہی میں (مارچ، اپریل ,2020) میں ہونے والے مسلم کش فسادات سے بھی میرے اس تاثر کو تقویت ملتی ہے۔ تمام ہنگامے ان علاقوں میں ہوئے جہاں پر مسلمان اکثریت میں تھے۔ بازاروں میں خواتین کی تعداد مردوں کی نسبت کافی زیادہ تھی۔ بحیثیت مجموعی ساڑھی پہنی ہوئی خواتین کی تعداد نمایاں تھی۔

میں سائیکل رکشہ چلانے والوں کے پاس جہاں وہ سواریوں کا انتظار کرتے تھے بہت دیر تک کھڑا رہا اور یہ سننے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ کیا باتیں کرتے ہیں۔ میں نے جو محسوس کیا اس کے مطابق دو باتیں بڑی واضح تھیں، ایک تو ان رکشہ چلانے والوں میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور دوسری یہ کہ ان کی زبان بھی بہت سخت تھی۔ وہ آپس میں کافی سخت لہجہ میں بات کر رہے تھے۔ دہلی میں عام آدمی کا لہجہ بھی خاصہ تحکمانہ تھا۔ اگر میں نے کسی سے راستہ پوچھا تو اس نے راستہ بتاتے ہوئے بھی اپنا احساس تفاخر ضرور ظاہر کیا۔

میں چاندنی چوک کے قریب ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے لیے چلا گیا ۔یہ ریسٹورنٹ ہماری پرانی انارکلی میں واقع ریسٹورنٹس جیسا تھا۔ کھانوں کی ایک طویل فہرست تھی جن کے بڑے ہی خوبصورت نام تھے۔ میں سفر میں سبزی اور دال کو پسند کرتا ہوں لہٰذا یہاں پر بھی میں نے سبزی ہی کھائی۔لاہور اور دلی کے کھانوں میں مرچ مصالحوں کی مقدار کا واضح فرق تھا۔ اس قدر مصالحہ جات استعمال کیے گئے تھے جو تقریباً میرے لیے نا قابلِ برداشت تھے۔

ایسا تو ہوتا ہے ایسے کاموں میں۔۔۔

ایک اور بات جو ممکن ہے آپ کو بھی پسند نہ آئے، وہ صفائی ستھرائی کی طرف سے لاپرواہی تھی۔ اس کا جتنا خیال ہم سب کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو کرنا چاہیے، اس میں بہت زیادہ کمی تھی۔ ایک بات جو بے حد خوبصورت لگی، وہ نماز کے وقت بہت خوبصورت انداز میں اذانوں کا سنائی دینا تھا اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں کا نماز کے لیے مساجد کا رخ کرنا تھا۔ مساجد جانے والے اکثر لوگوں کا لباس سفید کرتا پاجامہ اور سر پر سفید ٹوپی تھی۔

میری دیرینہ خواہش تھی کہ میں ہمدرد دواخانہ جاتا۔اس وقت حکیم سعید شہید صاحب کے بڑے بھائی حکیم عبدالمجید حیات تھے۔ میں ان کے دفتر گیا بھی لیکن تھوڑی دیر ہو گئی، شام کا وقت تھا اور دفاتر بند ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود میں باہر سے ہمدرد وقف کی عمارت کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

ایک اور جگہ جہاں میری جانے کی خواہش تھی، وہ راج گھاٹ تھا، یعنی جہاں راجوں کی آخری رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ یہ ایک وسیع میدان ہے ۔ راج گھاٹ پر ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں کی آخری رسومات ادا کی گئی ۔ ان میں سب سے اہم مہاتما گاندھی کی آخری رسومات ہیں۔ مہاتما گاندھی کے علاوہ بھی بہت بڑی بڑی شخصیات،

جن میں نہرو کے ساتھ ساتھ اندرا گاندھی بھی شامل ہیں، کی آخری رسومات ادا کرنے کی جگہ بھی اسی علاقہ میں موجود ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں پر مردے نذرِ آتش کرتے ہیں اور مرنے والے کی یاد میں اس جگہ پر کوئی یادگار بنادی جاتی ہے۔ یہ ایک اہم تاریخی علاقہ ہے جسے میں صرف دور سے دیکھ سکا۔

ایک اور علاقہ جو پورے بھارت میں کتابوں کی مارکیٹ کی وجہ سے بہت مشہور ہے، دریا گنج کہلاتا ہے۔ کسی دور میں یہاں پر انگریزوں کی چھاؤنی ہوتی تھی اور اب یہاں پر کتابوں کی بہت بڑی مارکیٹ ہے۔

دلی کے بازاروں میں چلتے ہوئے مجھے سید مودودی کے پاؤں کی آہٹ بھی سنائی دی۔ مجھے وہ آواز بھی سنائی دی جب مسلمانوں کے ایک بڑے رہنما مولانا محمد علی جوہر نے جامع مسجد دہلی میں کہا تھا کہ کون ہے جو ہندوؤں کے جہاد پر لگائے گئے الزامات کا جواب دے؟ پھر ایک 22 سالہ نوجوان سید مودودی علیہ رحمت نے الجہاد فی الاسلام نامی کتاب لکھ کر ان کی اس خواہش کو پورا کیا۔ میرے راستے میں کشمیری گیٹ بھی آیا، جسے خونی گیٹ بھی کہتے ہیں۔ اس گیٹ کے آس پاس انگریزوں نے اپنے ہندوستانی سپاہیوں کی مدد سے ہزاروں لوگوں کو قطار میں کھڑا کرکے شہید کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ جنگ آزادی کے بعد دلی کے گردونواح میں 25 ہزار سے زائد لوگوں کو شہید کیا گیا۔اس وقت انگریزوں نے مسلمان اور غیر مسلمان میں کوئی تمیز نہیں کی تھے۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے انگریزوں اور اُن کی فوج میں شامل سکھوں, مسلمانوں اور ہندو سپاہیوں کو صرف ایک رسی اور کسی درخت کی شاخ درکار ہوتی تھی۔ کسی بھی شخص کو شک کی بناء پر پکڑتے، گلے میں رسی ڈالتے اور کسی بھی درخت پر لٹکا دیتے۔ وہ لوگ خود ہی مدعی، خود ہی منصف اور خود ہی جلاد ہوتے تھے۔

میں انھی سوچوں میں دلی کے بازاروں میں گھومتا رہا اور سوچتا رہا وہ کون ہے جس نے دلی کو بخشا ہو؟

دلی کا حسن ہی اس کا قاتل ٹھہرا

امیر تیمور، نادر شاہ اور احمد شاہ درانی نے بھی اسے معاف نہیں کیا۔ انگریز بھی اس کا قلع قمع کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے، سب ہی اپنی باری پر آئے۔ اس سب کے باوجود دلی آج بھی موجود ہے۔ دلی کا ایک بڑا احسان یہاں پر اردو زبان کی آبیاری ہے، وہ اردو جو آج پوری دنیا میں بولی جاتی ہے اور اپنی ایک خاص پہچان رکھتی ہے۔ دلی کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن یہاں اتنا ہی کافی جو میر تقی میر نے کہا تھا۔۔۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پوُرب کے ساکنو

ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا

ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے



Nadar Shah Invaded Dilli Photo Credit: https://kreately.in

ماڈل ٹاؤن لاہور: جو ایک ہندو خاندان کو اب تک یاد ہے

بھارت جانے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایسی کمپنی تلاش کی جائے جو ویسٹ واٹر کی ٹریٹمنٹ کر سکے یعنی انڈسٹری سے نکلنے والے آلودہ پانی کو پروسس کرے اور اسے اس قابل بنائے کہ وہ دریا میں ڈالا جا سکے۔ اس سلسلہ میں میرا کچھ لوگوں سے رابطہ ہوا، ان میں ایک ہائی ٹیک پاور کمپنی بھی تھی۔ جب ان سے میرا رابطہ ہوا تو انھوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ اس کی شاید یہ وجہ تھی کی پاکستان سے میں پہلا شخص تھا جس نے ان سے رابطہ کیا تھا۔ جب انھیں یہ پتا لگا کہ میں لاہور سے ہوں تو انھوں نے زور دے کر کہا کہ آپ ہر صورت ہمارے دفتر آئیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی محبت سے کیوں بلا رہے ہیں؟ بہر حال میں نے اسے ایک عام سی بات سمجھ کر اپنے ذہن میں رکھ لیا۔

اندرون دلی کی سیاحت سے فارغ ہونے اور بیرا جی سے اپنے معاملات طے کرنے کے بعد اگلے دن میں نے ان کے دفتر جانے کا پروگرام بنایا۔ جب میں نے ان سے

رابطہ کیا تو کمپنی کے مالک راکیش گپتا صاحب نے مجھے لینے کے لیے گاڑی بجھوادی۔ اس طرح سے میں ان کے دفتر میں چلا گیا۔

جب میں ان کے دفتر میں گیا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ تو ایک بہت ہی بڑی کمپنی ہے جو پورے بھارت میں بڑے پاور پلانٹس کی کنسلٹنسی کے ساتھ ساتھ ان کی تعمیر بھی کرتی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس دفتر میں سو سے زیادہ لوگ کام کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے تو میں بے حد مرعوب ہوگیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی چھوٹی سی کمپنی ہے لیکن یہاں تو معاملات بالکل ہی مختلف تھے۔ راکیش گپتا صاحب کسی میٹنگ میں مصروف تھے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک میں فارغ نہیں ہو جاتا، آپ ہمارے سب سے سینئر مینیجر ڈاکٹر ادارش سے میٹنگ کر لیں۔

ڈاکٹر ادارش ان دلچسپ لوگوں میں سے ہیں جن سے زندگی میں میری ایک ہی ملاقات ہوئی اور وہ بھی ناقابل فراموش۔ ڈاکٹر ادارش ستر سال کی عمر کے ایک منجھے ہوئے نہایت ہی عقلمند اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ انھوں نے ایم آئی ٹی امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی تھی۔ اب وہ امریکہ کی کچھ فرمز کے ساتھ مل کر بھارت میں لگنے والے پاور پلانٹس کی کنسلٹنسی کرتے ہیں۔

آپ کو ایسے بے شمار لوگ مل جائیں گے جن کی اسی طرح کی تعلیم ہوگی اور کام بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے لیکن ڈاکٹر ادارش ایک مختلف شخصیت کے مالک تھے۔ میرے پاس تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد انھوں نے جیب سے ایک ڈبیہ نکالی جس میں کوئی دو انچ لمبائی اور چوڑائی کے باریک کاغذ تھے۔ پھر دوسری ڈبیہ نکالی جس میں تمباکو تھا۔ میرے سامنے انھوں نے میز پر کاغذ بچھایا پھر اس کے اوپر تمباکو ڈالا، کاغذ کو رول کیا اور پھر اپنے لب سے اسے جوڑنے کے بعد سلگایا اور سگریٹ پینا شروع کر دی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی بھی سگریٹ بنا کر پینے والا یہ عمل نہیں دیکھا تھا۔

عام طور پر اس طرح کے اداروں میں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہوتی، اس لیے مجھے کچھ عجیب بھی لگا۔ انھیں بھی اس بات کا احساس ہوا کہ میں کچھ الگ محسوس کر رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے کہا کہ میرے سوا اس دفتر میں کوئی شخص سگریٹ نہیں پی سکتا اور یہ لوگ مجھے منع نہیں کر سکتے کیونکہ اگر انھوں نے مجھے سگریٹ پینے کی اجازت نہ دی تو میں ان کا دفتر چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور مجھے چھوڑنا اس کمپنی کے لیے بہت بڑے نقصان کا باعث ہو سکتا ہے۔ میں تمام کنسلٹنٹس کا ہیڈ ہوں اسی لیے راکیش گپتا صاحب میری اس بدتمیزی کو برداشت کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک عام سی بات تھی کچھ دفاتر میں ایسا کر لیا جاتا ہے۔ دلچسپی کی بات اگلی تھی جو انھوں نے مجھے بتائی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی بیوی کلکتہ کی رہنے والی ہے اور وہ دونوں شملہ سے آگے ایک جنگل میں تنہا رہتے ہیں، جہاں پر بجلی بھی نہیں ہے۔ رات کو ہمارے گھر کے پاس جنگلی جانوروں اور درندوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ وہاں ایک انتہائی قدرتی ماحول ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ جس طرح اُس جنگل میں جانور رہ رہے ہیں اسی طرح سے ہم بھی اس جنگل میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہماری خوراک میں کوئی بھی چیز شہر سے نہیں آتی۔ ہم اپنا سب کچھ خود اگاتے ہیں۔ ہم گوشت نہیں کھاتے۔ جنگل کے اندر بے شمار پھل اور سبزیاں ہیں۔ میں اکثر اوقات گھر پر ہی رہتا ہوں اور وہیں بیٹھ کر اپنی سٹڈی اور اپنا کام کرتا ہوں۔ پندرہ دن کے بعد دو دن کے لیے شہر آتا ہوں اور پھر واپس چلا جاتا ہوں۔

جب وہ یہ باتیں بتا رہے تھے تو میں بڑے غور سے انھیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایک شخص جو ایم آئی ٹی امریکہ سے پڑھ کر آیا اور اتنی بڑی کمپنی کا ایک سینئر فرد بھی ہو۔ اس کی بیوی بھی ہزاروں میل دور کلکتہ سے آئی ہو اور یہ دونوں جنگل میں رہ رہے ہوں۔ انھوں نے قدرتی ماحول میں اپنی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیوں کر کیا ہو گا؟۔

میری حیرانی کو بھانپتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مشتاق جی، چشموں کا صاف پانی، پھولوں کی خوشبو سے معطر ہوا، خالص قدرتی ماحول میں پیدا ہوئی سبزی اور پھل جن پر کسی طرح کا کوئی بھی کیمیکل نہ چھڑکا گیا ہو، نہ ہی کھاد استعمال کی گئی ہو جب یہ سب کچھ میسر ہو تو اس سے بہتر زندگی کیا ہو گی؟ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے اس لیے بچوں کی کوئی فکر نہیں۔ میں مناسب پیسے کما لیتا ہوں۔ تھوڑا کھا لیتے ہیں، بہت سا بچ جاتا ہے۔ مجھے اور میری بیوی کو پڑھنے پڑھانے کا بہت شوق ہے۔ ہم اُس جگہ پر بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہیں اور کتابیں لکھتے ہیں۔

میری بیوی نے نیٹرو پیتھی میں ماسٹرز کیا ہوا ہے اُسے نت نئی جڑی بوٹیوں کی تلاش رہتی ہے۔ جنگل میں اُس کا یہ شوق بھی پورا ہو جاتا ہے۔ ہمارے ارد گرد بے شمار پرندے اور جانور پھرتے رہتے ہیں جو کہ ہمیں اپنا ہی حصہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح ہم ایک قدرتی ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں جسے ہر لحاظ سے ایک پرسکون زندگی کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت میری عمر 70 سال ہے اور میں اب تک کسی بھی بیماری کا شکار نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی بھی دوائی کھاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں گا ایسا ہی رہوں گا۔

آخر میں انھوں نے مجھے بتایا کہ مشتاق جی اگر آپ زیادہ دیر جنگل میں نہیں رہ سکتے تو کم از کم مہینے میں ایک دن قدرتی ماحول میں زندگی ضرور گزاریں۔ قدرتی کھانے کھائیں، شہر کے ہنگاموں سے دور رہیں۔ یقیناً یہ سب آپ کی ذہنی اور جسمانی صلاحیت کے لیے بے حد مفید ہو گا۔ میں ایسا تو نہ کر سکا لیکن زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ایک آدھ دن کے لیے گاؤں چلا گیا جہاں جنگل جیسا ماحول تو نہیں ہوتا لیکن بہر حال شہر سے مختلف ضرور ہوتا ہے۔ یہ تھے ڈاکٹر ادارش جو مجھے اب تک یاد ہیں۔ کچھ ہی دیر میں راکیش گپتا

صاحب بھی تشریف لے آئے اور وہ مجھے اپنے دفتر لے گئے۔ انھوں نے غیر معمولی طور پر میری خاطر مدارت کی اور مجھ سے لاہور کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

میں نے محسوس کیا کہ جب بھی لاہور کی بات ہوتی ہے تو وہ تھوڑے سے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ فوری طور پر مجھے اس رویہ کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ وہ مجھ سے لاہور کے متعلق بے شمار باتیں پوچھتے رہے، خاص طور پر ماڈل ٹاؤن کے متعلق انکی دلچسپی کچھ زیادہ ہی تھی۔ آخر میں پوچھنے لگے آج شام کی کیا مصروفیت ہے؟ میں نے بتایا کہ ابھی مجھے ایک دو جگہ جانا ہے اور پھر چار بجے تک میں اپنے ہوٹل آ جاؤں گا۔ آپ بتائیے کیا پروگرام ہے؟ انھوں نے کہا کہ آج شام کو آپ کو میرے گھر آنا ہو گا۔ مجھے تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی کہ یہ اتنا بڑا آدمی ہے اور اس کا اتنا ہی بڑا گھر ہو گا لیکن مجھے اتنی محبت سے اپنے گھر کیوں بلا رہے ہیں جبکہ میرا ان سے کوئی پرانا تعلق بھی نہیں ہے۔ میرے اندر ایک انجانا سا خوف بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں انکار بھی نہ کر سکا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں چار بجے ہوٹل میں تیار ہوں گا۔ آپ کسی کو بھجوا دیں تو میں آپ کے گھر آ جاؤں گا۔

ایک عمر رسیدہ ہندو خاتون: جس کے دل میں اب تک ماڈل ٹاؤن بستا ہے

شام چار بجے کے قریب میں ان کے بھیجے ہوئے آدمی کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا۔ وہ ایک بہت ہی بڑا گھر تھا جیسے ہر امیر آدمی کا ہوتا ہے۔ ذہن میں کئی خدشات لیے میں ان کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس دوران میں ان کا بیٹا جس کا نام موہن تھا جو کوئی بیس سال کی عمر کا ایک نوجوان تھا، بھی آ گیا اور اس نے مجھے خوش آمدید کہا۔ موہن بھی ایک دلچسپ لڑکا تھا، اس سے پہلے کہ ہم ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے وہ مجھے اپنا گھر دکھانے کے لیے لے گیا۔ اس نے مجھے بہت سارے کمرے دکھائے، تب اس

کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ موہن کی ایک دلچسپ بات، جو آپ کو بھی دلچسپ لگے گی، اس سے پہلے اور اس کے بعد کہیں نہیں دیکھی۔

موہن نے مجھے بتایا کہ اسے ٹھنڈ بہت پسند ہے جبکہ دلی میں گرمی ہوتی ہے ۔اس لیے اس نے اپنے بیڈ روم میں دو اے سی لگائے ہوئے ہیں۔ جب میں اس کمرہ میں گیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی برفانی علاقہ میں آ گیا ہوں۔ موہن نے بتایا کہ یہ دونوں اے سی پوری گرمیاں بند نہیں ہوتے اور سارا دن چلتے رہتے ہیں۔ جب میں رات کو اس کمرے میں آتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی برفانی علاقے میں آ گیا ہوں۔ یہ میرا ایک انوکھا شوق ہے اور ڈیڈ کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہے۔ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ یہ فضول خرچی ہے۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں اس لیے وہ مجھے منع نہیں کرتے۔

گھر کی سیر کے بعد ہم نیچے فیملی روم میں آ گئے جہاں ان کی فیملی کی بے شمار تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی تک میری حیرانی دور نہیں ہوئی تھی اور مجھے سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ میرے ساتھ یہ خصوصی سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟

اتنی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک خاتون، جن کی عمر ستر اسی سال کے قریب ہو گی لیکن وہ بہت صحتمند تھیں، انھوں نے بڑی اچھی ڈریسنگ کی ہوئی تھی وہ اپنی وہیل چیئر پر کمرے میں آ گئیں۔ ان کے احترام میں ہم سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سب نے انھیں سلام کیا میں نے بھی سلام کیا اور پھر ہم سب دوبارہ بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب آگے کیا ہو گا؟ کچھ وقت گزرا تو میں نے محسوس کیا کہ بوڑھی اماں کی آنکھوں میں آنسو ہیں اور وہ ان کو اپنے پلو سے پوچھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میری حیرانی مزید بڑھ گئی کہ یہ کیا معاملہ ہے؟

کچھ دیر بعد انھوں نے ایک گہری سانس لی اور مجھے کہنے لگیں کہ آج مجھے پچاس سال پرانی بات یاد آ رہی ہے۔اسی لیے جب مجھے پتہ چلا کہ کوئی لاہور سے آ رہا ہے تو

میں نے راکیش سے کہا کہ اسے گھر لے کر آنا۔ آپ نے ہماری دعوت قبول کی، میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے جو بات شروع کی وہ اب تک جاری ہے اور مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے کان ابھی بھی ان کے کہے ہوئے الفاظ سن رہے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ میرے میاں ڈنڈوت سیمنٹ پلانٹ میں مینجر تھے جو انگریزوں کی ملکیت تھا۔ ہم ماڈل ٹاؤن لاہور میں رہائش پذیر تھے، گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمارا دفتر شملہ منتقل ہو جاتا اور ہم چار ماہ شملہ میں رہتے تھے۔ ہم صدیوں سے لاہور کے رہنے والے تھے۔ پہلے ہم اندرون لاہور رہتے تھے لیکن جب ماڈل ٹاؤن آباد ہوا تو ہم ان لوگوں میں سے تھے جو سب سے پہلے آ کر ماڈل ٹاؤن میں آباد ہوئے تھے۔ ہمارا تعلق کشمیر سے تھا ہم کشمیری برہمن نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری اور میرے میاں کی تعلیم وتربیت لاہور میں ہوئی۔ شادی کے بعد میں اپنے میاں کے ساتھ ماڈل ٹاؤن آ گئی۔ ہمارا بڑا سا گھر تھا۔ ہمارے گھر کی کوئی چار دیواری نہیں تھی اور ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔ ہم ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔

یہ کہتے وہ رک گئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد بولیں کہ راکیش نے پہلا قدم ماڈل ٹاؤن میں ہی اٹھایا تھا۔ اس کے چلنے کی خوشی میں ہم نے ایک دعوت کا اہتمام بھی کیا تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد تقسیم ہند کی بات ہونے لگی۔ ہمارا تو سب کچھ ہی لاہور تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گا؟ تقسیم ہند تک تو بات ہماری سمجھ میں آتی تھی لیکن اس سے آگے کیا ہو گا یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی؟

پھر ایک دن پتہ چلا کہ قتل و غارت شروع ہو گئی ہے، ہندوستان سے آنے والے مسلمانوں کو ہندوستان میں قتل کیا جا رہا ہے۔ جب ان کی لاشیں لاہور سٹیشن پر آئیں تو یہاں بھی لوگوں کو غصہ آیا اور انھوں نے یہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کا قتل

عام شروع کر دیا۔ لوگ جان بچا کر بھاگ رہے ہیں ۔انھی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے پرانے محلے ، اندرون شہر میں جہاں ہندو اکثریت میں رہتے تھے کا پانی بند کر دیا گیا ہے۔ ہندو اکثریت کے علاقے کرشن نگر میں بھی قتل و غارت شروع ہو گئی ہے۔ یہ بات بڑھتی چلی گئی ہے۔ چند دن پہلے ہم راکیش کے پہلا قدم اٹھانے کی خوشی منا رہے تھے اور اب یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ راکیش کو بچائیں گے کیسے ؟

ارد گرد کے حالات کو دیکھ کر صاف نظر آ رہا تھا کہ لاہور میں رہنے والے تمام ہندوؤں اور سکھوں کو اس علاقے میں جانا ہو گا جو تقسیم ہند کے بعد بھارت کا حصہ بن گیا ہے۔ پھر ایک دن پتہ چلا کہ ایک گاڑی ہندوؤں اور سکھوں کو لے کر بھارت جائے گی لیکن سٹیشن تک کیسے جایا جائے گا؟ یہ بہت بڑا سوال تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ مشتاق بیٹا میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ کتنا خوف تھا؟ کئی دن تک ہمارے گھر میں میں کوئی کھانا نہیں بنا، بس ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ خبریں سنتے تھے تو خوف میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔

ماڈل ٹاؤن میں ہمارے ساتھ والے بلاک میں ایک خاتون رہتی تھیں، جنھیں ہم مسز خان کہتے تھے۔ وہ ایک امیر عورت تھی ان کے گھر میں کئی گاڑیاں بھی تھیں اور وہ کافی اثر و رسوخ والے لوگ تھے۔ ہمارا ان کی طرف آنا جانا بھی تھا۔ اس خوف کے عالم میں جب کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی، ایک دن اوپر والے نے کرم کیا اور مسز خاں ہمارے گھر آئیں اور انھوں نے ہمیں حوصلہ دیا۔ لیکن صرف حوصلہ سے تو مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال ایک امید ضرور پیدا ہو گئی۔

مسز خان نے ہمیں کہہ رکھا تھا کہ آپ ہر وقت تیار رہیں، میں کسی بھی وقت آپ کو لے کر ریلوے سٹیشن چھوڑنے کے لیے آ سکتی ہوں۔ ہم نے کیا تیار ہونا تھا۔ کچھ قیمتی سامان ہم نے ایک بیگ میں رکھ لیا۔ ایک ہی بیٹا تھا، وہی ہماری سب سے بڑی متاع

تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی ہر وقت ایک کونے میں بیٹھے رہتے اور مسز خان کا انتظار کرتے۔ ہمیں ہر آہٹ پر ان کی آمد کا گماں گزرتا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا، جب ہمیں کسی نے بہت آہستہ سے آواز دی، رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہم انے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے گھر پر آخری نظر ڈالی اور باہر تاریکی میں کھڑی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ مسز خان ہم تینوں کو رات کی تاریکی میں ماڈل ٹاؤن سے سٹیشن تک لے آئیں۔ مسز خان نے ہمیں یہ بتایا کہ وہ صبح سے اب تک دس خاندانوں کو ماڈل ٹاؤن سے سٹیشن پہنچا چکی ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہم رات کے ندھیرے میں ایک ٹرین میں بیٹھ کر بھارت کی طرف روانہ ہو گئے۔۔۔

اور میں رات کی تاریکی کی وجہ سے لاہور کو آخری مرتبہ جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکی۔ بھارت آنے کے بعد باوجود شدید خواہش کے کبھی لاہور جانا نہیں ہوا۔

جب ہماری گاڑی چلی تو اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی ہندوستان کی طرف سے آکر رکی ہے۔ اس میں بے شمار لوگ زخمی حالت میں تھے اور لاشوں کے انبار بھی نظر آرہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں جن کو ہندوؤں اور سکھوں نے بھارت میں قتل اور زخمی کیا تھا۔ جو لوگ بھارت جارہے تھے وہ بھی زخمی اور جو آرہے تھے وہ بھی بد حال۔ ہم انتہائی کسمپرسی کی حالت بھارت میں آگئے۔ ہم یہاں کئی سال عارضی رہائش گاہوں میں رہے۔ وہ زندگی کے اتنے مشکل دن تھے کہ ہم زندگی میں اٹھائی ہوئی ہر آسائش بھول گئے۔

بھارت آنے کے بعد ہمارا مسز خان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ آج آپ آئے تو مجھے مسز خان بھی یاد آئیں اور ہمارے وہ ہمسائے بھی یاد آئے جو سٹیشن تک آتے ہوئے قتل کر دیے گئے تھے۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں اپنی ماں سے ان کی ہجرت کی داستان سن رہا ہوں کہ وہ کس طرح سے ہندوستان سے پیدل قصور پہنچیں اور تیرا سال کی عمر میں کئی سو میل کا پیدل سفر اپنے خاندان کے ساتھ طے کیا۔

میری والدہ کے خاندان کے کتنے ہی لوگ قتل کیے گئے اور کتنے ہی اغوا کیے گئے۔ ان کی تعداد کتنی تھی؟۔۔۔

جب کوئی چیز ان گنت ہو تو اسے گنا کیسے جاسکتا ہے؟۔۔۔ وہ تو ان کے اپنے خونی رشتہ دار تھے جن کو گننے کا حوصلہ بھی کس میں تھا

! مجھے یہ بھی یادِ آیا کہ میری والدہ اور ان کا خاندان کس طرح ایک سال سے سے زائد عرصہ تک سکھ بن کر اور اپنے گھروں میں چھپ کر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ ان کو بھی ایک "مسز خاں "نے پناہ دی تھی۔ میری والدہ کے خاندان کو بچانے والے محسن کا نام سردار دلیر سنگھ کھروڑ تھا جو میری والدہ کے گاؤں کا نمبردار تھا۔۔۔

دونوں طرف مارنے والے بھی تھے اور بچانے والے بھی۔۔۔ کوئی مسز خان تھا اور کوئی دلیر سنگھ۔۔۔

درد تو درد ہی ہوتا ہے وہ کسی کا بھی ہو، بات تو صرف محسوس کرنے کی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اماں جی نے بہت ساری باتیں کیں۔ میں پوری توجہ سے سنتا رہا اور جب وہ تھک کر جانے لگیں تو میرا سر چوم کر کہا کہ لاہور جا کر مسز خاں کو ڈھونڈنا اور مل جائیں تو میرا سلام کہنا۔۔۔ کہنا کہ ایک خاندان آپ کے احسان کا اب تک شکر گزار ہے۔۔۔

اب مجھ میں بھی مزید باتیں سننے کی ہمت باقی نہ تھی۔۔۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ چائے کی آدھی پیالی چھوڑ کر میں نے رخصت چاہی۔۔۔ گفتگو کا یہ سلسلہ پچھلے پچیس سال سے چل رہا ہے۔۔۔ لگتا ہے کہ گفتگو ابھی ادھوری ہے۔۔۔ نا جانے کب بات دوبارہ شروع ہو جائے۔۔۔

میں نے ماڈل ٹاؤن میں رہنے والے اپنے ایک دوست جن کا نام یوسف خان تھا سے مسز خاں کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے بھی ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ایک عظیم خاتون تھیں جنھوں نے بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کو سٹیشن پر پہنچایا تھا لیکن یہ بہت پرانی بات ہے۔ مدت ہوئی کہ وہ اللہ کے پاس چلی گئیں۔۔۔ اللہ ان کی روح کو سکون عطا فرمائے۔۔ آمین۔

میں معافی چاہتا ہوں کہ یہ سفر نامہ ایک درد نامہ میں تبدیل ہو گیا۔۔۔ لیکن ایسا ہی ہوا۔۔۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے۔۔۔ اس کا ذکر ضروری تھا تا کہ راکیش اور مشتاق کو یاد رہے کہ ان کے بڑوں پر کیا بیتی۔۔۔ یہ ہم سب کی خواہش ہے آئندہ ایسا نہ ہو !

بہائی ایک مذہبی فرقہ جو تقریباً دو سو سال پہلے وجود میں آیا

بہائی مذہب کی بنیاد 19ویں صدی کے وسط میں مرزا حسیان علی نوری نے رکھی تھی، جسے بہا اللہ (خدا کی شان) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بہائی عقیدے کے لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ بہا اللہ اور اس کا پیش رو خدا کے مظہر تھے۔ اس مذہب کے مطابق، تمام مذاہب اور انسانیت کا اتحاد ہونا نہایت ضروری ہے۔ بہائی انسانیت کی یکجہتی پر یقین رکھتے ہیں اور نسلی، طبقاتی اور مذہبی تعصّبات کے خاتمے کے لیے خود کو وقف کرتے ہیں۔ بہائی کی تعلیمات کا بہت بڑا حصہ معاشرتی اخلاقیات سے وابستہ ہے۔ ان کی تعداد پوری دنیا میں پچاس لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے۔

پاکستان میں بہائی عقیدے کا آغاز تقسیم ہند سے پہلے ہو گیا تھا۔ شیخ سعید ہندی جو ملتان سے تھے پاکستان میں اس فرقہ کے بانی مانے جاتے ہیں۔ ان کے بانی کا کہنا ہے کہ انسانی اتحاد میں اتنی طاقت ہے کی یہ پوری دنیا کو روشن کر سکتی ہے۔

بہایوں نے 1986ء میں دہلی کے اندر اپنی ایک عبادت گاہ بنائی جس کا نام اس کے ڈیزائن کی وجہ سے لوٹس ٹیمپل، یعنی کنول کا پھول رکھا گیا۔ اگر آپ نئی دہلی سے

جنوب کی طرف چلیں تو پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر خواجہ نظام الدین کے مزار والے علاقے کے بعد یہ عمارت موجود ہے۔ایک وسیع و عریض میدان کے درمیان میں یہ ایک بہت بڑی عمارت ہے جو پنکھڑیوں کی شکل کی ہے اور اسکے ارد گرد باغیچے اور لان ہیں۔

اس عبادت گاہ کی دو انفرادی خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیت اس عمارت کا ڈیزائن ہے جسے کنول کے پھول کی طرح بنایا گیا ہے۔ اسکی 23 مختلف پنکھڑیاں ہیں اور ان کے تین سیٹ بنائے گئے۔ اس عمارت کی اونچائی 40 میٹر ہے۔ مرکزی ہال کا فرش بھی یونانی سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ اس جگہ کا کل رقبہ 26 ایکڑ ہے۔ دوسری اہم بات اس عمارت کی یہ ہے کہ اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد آپ کو کسی بھی طرح کی گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ سب کو خاموش ہو کر بیٹھنا ہوتا ہے۔ یہ شاید بہائی لوگوں کے عبادت کرنے کا طریقہ ہے۔

میں نے اس عمارت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ میرے پاس تھوڑا سا وقت بھی تھا لہٰذا اس وقت کا استعمال کرتے ہوئے اس جگہ جانے کا فیصلہ کیا۔ جب میں لوٹس ٹیمپل پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی اور وہاں پر خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ میں عمارت کے مین ہال میں چلا گیا جو کہ خاصہ بڑا تھا۔ اس میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہال میں پچیس سو لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔

میں نے دیکھا کہ مختلف جگہوں پر لوگ بیٹھے تھے، نا کوئی پڑھ رہا تھا، نا کوئی تسبیح کر رہا تھا اور نا ہی کوئی بول رہا تھا۔ ہال میں اتنی خاموشی تھی کہ جس کا اندازہ کرنا بے انتہا مشکل ہے۔ ایک تو یہ جگہ شہر سے دور ہے، دوسرا اس کے ارد گرد دور دور تک ٹریفک نہیں ہے، کوئی بھی گاڑی اس عمارت کے قریب نہیں آتی۔ لگتا ہے کہ یہاں پر خاموشی ہی عبادت سمجھی جاتی ہے۔ میں بڑی دیر تک لوگوں کو دیکھتا رہا، اکثر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے اور مسلسل کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ شائد یہ بھی ایک طرح کا نفسیاتی علاج ہوتا ہو

گا۔ایسی صورتِ حال میں لوگوں کو اپنے آپ کے متعلق سوچنے کا موقع ملتا ہے۔ میں بھی وہاں پر چلا گیا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ جب آپ کے سامنے بہت ہی خوبصورت عمارت ہو جس کی کسی بھی دیوار پر کوئی تحریر نہ ہو اور نہ ہی کوئی تصویر، ایسی صورت میں آپ خاموشی سے بیٹھیں تو لازمی بات ہے کہ آپ کو بھی بہت کچھ سوچنے کو ملتا ہے۔

جب میں ہال میں چپ چاپ بیٹھا تھا تو مجھے یاد آیا کہ جب پہلی مرتبہ میں عمرے کے لیے مکہ شریف جا رہا تھا تو میرے ایک دوست ڈاکٹر عبد المتین، وہ لیفٹ کے بڑے نظریاتی لیڈر رہتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ کیمیکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کی ہوئی تھی اور پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر بھی تھے، نے مجھے یہ کہا کہ جب تم خانہ کعبہ جاؤ تو کسی کونے میں بیٹھ کر اللہ کے گھر کو دیکھنا اور اللہ سے باتیں کرنا۔ جو آپ کے دل میں آئے وہ کہنا، جو مانگنا چاہو وہ مانگنا، جو گلہ شکوہ ہو وہ بھی کرنا لیکن یہ سب کچھ اپنے دل میں کہنا، آواز نہ نکلے، تمھیں جواب ملے گا۔انھوں نے مزید کہا کہ میرا یقین ہے کہ اللہ تمہاری باتوں کا جواب دے گا اور تم اسے محسوس بھی کروگے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور ایک خوبصورت تجربے سے گزرا، ایسا کرنے سے ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی، جو اب تک یاد ہے۔

اس ٹیمپل میں آکر بھی مجھے یوں لگا کہ اس مذہب کے ماننے والوں نے خاموشی سے اپنے خدا سے باتیں کرنے کے لیے یہ ٹیمپل بنایا ہے۔ ہر مذہب میں خدا کا تصور موجود ہے کیونکہ یہ مذہب کی بنیاد ہے۔ خدا کا تصور کیسا ہے اس میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن خدا کے تصور کے بغیر کوئی مذہب نہیں ہو سکتا۔ مذہب کی بنیاد ہی یہ ہے کہ کسی ان دیکھی طاقت کو ماننا اور اس پر یقین کرنا۔

میرے لیے یہ تجربہ انتہائی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد منفرد بھی تھا۔ ٹیمپل میں دیواروں پر اسلام اور عیسائیت کے علاوہ بھی کئی اور مذاہب کے مقدس

مقامات کی تصاویر لگی ہوئیں تھیں جو اس بات کو ظاہر کرتی تھیں کی اس مذہب کے ماننے والے دیگر مذاہب کا بھی احترام کرتے ہیں۔

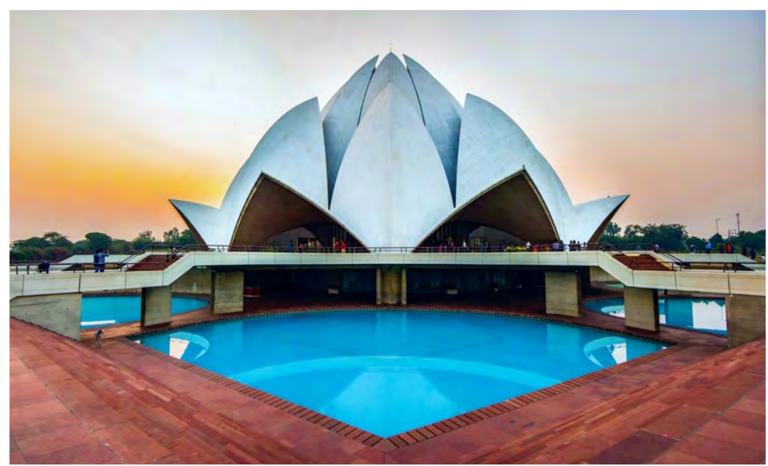
آپ خاموش بھی ایک خاص وقت تک ہی رہ سکتے ہیں۔ خاموش رہنے کا یہ تجربہ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ میں اب بھی کبھی کبھار یہ تجربہ کرتا ہوں جس سے بڑا روحانی سکون ملتا ہے۔۔۔آپ بھی کرکے دیکھیں۔۔۔

بہائی لوگوں کے متعلق مزید جاننے کے لیے Warburg Margit کی کتاب

Citizens of the World A: History and Sociology of the Bahais′

from a Globalisation Perspective

بہت مفید ہے۔



Lotus Temple Dehli https://planetofhotels.com

جماعت اسلامی ہند اور لکھنؤ کے امیر جماعت اسلامی

بہائیوں کے ٹیمپل کے بعد میری اگلی منزل جماعت اسلامی ہند کا دفتر تھا۔ وہ دفتر دریا جمنا کے پاس ابوالفضل انکلیو میں واقع تھا۔ میں نے کسی سے ان کا پتہ لیا اور ان کے دفتر چلا گیا۔ جماعت اسلامی ہند کا دفتر ایک انتہائی سادہ عمارت میں واقع تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ دفتر لمبائی میں زیادہ تھا اور چوڑائی میں کم تھا۔ زیادہ تر لوگ ایک بڑے ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جماعت اسلامی ہند کے امیر دفتر میں موجود نہیں تھے۔ میں نے استقبالیہ پر ایک صاحب کو اپنا تعارف کروایا۔ انھوں نے مجھے جماعت اسلامی کے شعبہ نشرواشاعت کے ایک ذمہ دار کے پاس بھجوا دیا۔ میں ان صاحب کے پاس کافی دیر بیٹھا رہا۔ اس وقت وہاں پر جماعت اسلامی لکھنؤ کے امیر بھی تشریف فرما تھے۔

امیر صاحب بہت ہی شائستہ اردو میں بات کر رہے تھے۔ انکی عمر ستر سال سے زائد تھی، سفید چمکتا ہوا رنگ اور سفید داڑھی کے ساتھ بڑی ہی پیاری اور وضع دار شخصیت کے مالک تھے جس نے مجھے پہلی ہی نظر میں ان کا گرویدہ بنا دیا۔ یہ میرا کسی بھی لکھنؤ کے فرد کے ساتھ پہلا براہ راست رابطہ تھا۔ یاد رہے جماعت اسلامی کا قیام 1941ء میں لاہور میں عمل میں آیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد 1948ء میں جماعت اسلامی ہند کے نام سے جماعت اسلامی کا نیا تنظیمی ڈھانچہ بنایا گیا اور اس کے دستور میں بھی ضروری ترامیم کی گئیں۔

شعبہ نشرواشاعت کے انچارج نے مجھے بتایا کہ اس وقت ہم تین شعبہ جات میں کام کر رہے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا شعبہ جو سب سے زیادہ متحرک بھی ہے وہ دعوت کا شعبہ ہے۔ ہم خاص طور پر غریبوں میں کام کرتے ہیں اور انھیں دائرہ اسلام میں بھی داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے بھی دعوت کا کام جاری ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ہمارا دوسرا شعبہ تعلیم کا شعبہ

ہے۔ ہمارے سکولوں کے ساتھ ساتھ مدارس بھی ہیں اور تعلیم کے دیگر شعبوں میں بھی ہم خاصے متحرک ہیں۔ ہم یہ کام بہت بڑی تعداد میں تو نہیں کر پا رہے لیکن جتنا بھی ہم سے ممکن ہو پاتا ہے، وہ ہم کرتے ہیں۔ تعلیم کا کام ہم مسلمانوں سمیت سب لوگوں کے لیے کرتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ان کا تیسرا شعبہ عام لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام ہے۔ اس کام کے لیے مختلف علاقوں میں مختلف تنظیمیں کام کرتی ہیں۔ مرکزی تنظیم کا نام ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن ہے۔ ملک میں کسی بھی مسئلے کی صورت میں ہم آگے بڑھ کر ریلیف کا کام کرتے ہیں۔ اس میں بے شمار لوگ ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ ہمارے اس شعبہ کو بھارتی معاشرے میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

جب میں نے ان سے یہ پوچھا کہ سیاسی طور پر ان کی حکمت عملی کیا ہوتی ہے؟ جواب میں انھوں نے بتایا کہ ہم اپنے معروضی حالات کے مطابق کسی سیاسی جماعت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہماری طاقت بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن ہمیں کسی نا کسی کے ساتھ کھڑے تو ہونا ہی پڑتا ہے۔ البتہ ہم بین الاقوامی معاملات میں حکومت ہند کی پالیسی کو ہی فالو کرتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے بتایا کہ وہ نوجوانوں میں بھی کام کر رہے ہیں لیکن وہ کام بہت محدود پیمانے پر ہے۔

میں نے ہندو مسلم فسادات کے بارے میں ان سے پوچھا جس کے جواب میں انھوں نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ ہم ہر جگہ اس کی مذمت کرتے ہیں لیکن اکا دُکا ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنے کچھ رسالے بھی دکھائے جو وہ ہفتہ وار اور ماہانہ بنیادوں پر نکالتے ہیں۔ جماعت اسلامی لکھنئو کے امیر صاحب سے بھی میں کافی دیر باتیں کرتا رہا۔

میرا مقصد معلومات کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت اور خالص اردو سننا بھی تھا۔ میں ان کے اندازِ گفتگو سے تادیر لطف اندوز ہوتا رہا۔ انھوں نے بھی مجھ سے جماعت اسلامی پاکستان کے بارے میں پوچھا تو جو میرے علم میں تھا میں نے انھیں بتایا۔ اُٹھنے سے پہلے ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے ایک سوال پوچھا کہ پچھلے دنوں لکھنؤ میں ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں ان فسادات کا آغاز کون کرتا ہے؟ میرے اس سوال کے جواب میں وہ مسکرادیے اور میں سمجھ گیا اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ان سے اجازت چاہی اور ہوٹل کی طرف چل دیا۔

مقبرہ نصیر الدین محمد ہمایوں

آج کے دن میں نے دہلی میں موجود چند تاریخی مقامات پر جانے کا پروگرام بنایا۔ میری پہلی منزل ہمایوں کا مقبرہ تھا۔ ہمایوں کا پورا نام نصیر الدین محمد ہمایوں ہے۔ آپ کی پیدائش 1508ء میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ بچپن میں سخت بیمار ہو گئے تھے۔ آپ کے والد، ظہیر الدین بابر جو ہندوستان میں مغل سلطنت کے بانی ہیں، نے منت مانی کہ ان کی زندگی ان کے بیٹے کو لگ جائے۔ ظہیر الدین بابر بیمار ہو کر فوت گئے اور نصیر الدین محمد ہمایوں ٹھیک ہو گئے۔ کہانی اسی طرح سے مشہور ہے۔ ظہیر الدین بابر کی جلد موت کی وجہ سے بائیس سال کی عمر میں ہمایوں کو سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنا پڑی۔ بائیس سال کا نا تجربہ کار نوجوان اتنی بڑی سلطنت کو سنبھال نہ سکا۔

مغل فوج میں بہت سارے افغان جرنیل تھے، جن میں شیر شاہ سوری اور اس کا والد بھی شامل تھے۔ ان افغان سرداروں نے شیر شاہ سوری کی قیادت میں بغاوت کردی اور بنگال سے شروع ہو کر آہستہ آہستہ مغلوں کی پوری سلطنت پر قبضہ کرلیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہندوستان سے مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

پندرہ سال تک ہمایوں اپنے چند سو ساتھیوں کے ہمراہ دلی چھوڑ کر سندھ، بلوچستان، افغانستان اور ایران کے علاقوں میں پھرتا رہا۔ پھر ایک وقت آیا جب ہمایوں نے مغلوں کے وفادار لوگوں کی فوج اور ایران کے حکمرانوں کی مدد سے شیر شاہ سوری کی موت کے بعد اس کے بیٹوں سے جنگ کرکے اپنی سلطنت واپس لے لی اور دلی واپس آگیا اور مغل سلطنت کی نئے سرے سے شروعات کیں۔ اس دربدری کے دور میں سندھ کے ایک عام سے قلعہ میں جہاں ہمایوں نے پناہ لی ہوئی تھی، اکبر کی پیدائش ہوئی۔

میں آج اسی بادشاہ کے مقبرے پر جا رہا تھا جس نے نئے سرے سے مغل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ایک لحاظ سے ہمایوں کا مقبرہ وہ پہلی بڑی عمارت تھی جو مغلوں نے ہندوستان میں بنائی۔ اس عمارت کی تعمیر میں پہلی بار سرخ پتھر کا استعمال کیا گیا۔ یہ مقبرہ اور اس سے ملحقہ باغات، ہمایوں کی بیوی حاجن بیگہ بیگم نے اپنے شوہر کی یاد میں بنوائی تھی۔ پھر اس کے بعد بہت ساری بیگمات نے اپنے شوہروں اور بہت سارے شوہروں نے اپنی بیگمات کے مزارات بنوائے، جیسے لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ اس کی بیگم نے بنوایا۔ اسی طرح سے تاج محل، ممتاز محل کے خاوند شاہجہاں نے بنوایا اور یوں مغلوں میں یہ رواج عام ہوگیا۔ مغلوں نے مقبرے کو صرف مقبرہ ہی نہیں رہنے دیا بلکہ اس کے ارد گرد اتنے خوبصورت باغات بنوائے کہ وہ باقاعدہ تفریحی مقامات بن گئے۔ ان میں سے تاج محل نے ایسی شہرت حاصل کی کہ وہ دنیا کے عجائبات میں شامل ہوگیا۔

اگر آپ کا لاہور میں موجود جہانگیر کے مقبرہ پر جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہمایوں کا مقبرہ کیسا ہوگا؟ دونوں کے طرزِ تعمیر میں خاصی مماثلت ہے البتہ یہ بات بھی درست ہے کہ ہمایوں کا مقبرہ اپنی وسعت کے اعتبار سے جہانگیر کے مقبرے سے زیادہ بڑا ہے۔

ہمایوں کا مقبرہ درگاہِ نظام الدین کے قریب واقع ہے۔ میں نے درگاہ جانے سے پہلے ہمایوں کے مقبرہ پر جانے کا فیصلہ کیا۔ اس علاقے میں ایک پرانا قلعہ بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہمایوں کی موت اسی قلعے میں واقع ہوئی تھی اور اسی قلعہ میں ہی انھیں دفنایا گیا تھا۔ اس کے بعد نا جانے کیوں، ہمایوں کی میت موجودہ بھارتی پنجاب کے شہر سرہند لے جائی گئی اور انھیں وہاں دفنایا گیا۔ بعد میں جب یہ عمارت تعمیر ہو گئی تو ان کی میت کو سرہند سے لاکر اس مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ اس مقبرے کی تعمیر اکبر کے دور میں ہوئی لیکن اس کی تعمیر کی تمام تر نگرانی ہمایوں کی بیوی حاجن بیگم نے کی اور اس کا خرچ بھی خود ہی برداشت کیا تھا۔

اس مقبرے سے ایک اور دلچسپ کہانی بھی جڑی ہوئی ہے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد بہادر شاہ ظفر نے یہاں آکر پناہ لی اور پھر یہیں سے ان کی گرفتاری بھی ہوئی۔ ان کے ساتھ جو بھی ظلم ہوئے وہ زیادہ تر اسی مقام پر ہوئے۔ اس جگہ کو مقبرہ کہنا درست نہیں ہے کیونکہ مقبرے میں تو کسی جگہ کے اوپر ایک قبر ہوتی ہے۔ یہ جگہ تو درحقیقت ایک وسیع باغ ہے جس کے اردگرد ایک اونچی چاردیواری ہے۔ باغ میں چاروں طرف پانی کے تالاب ہیں اور بے شمار فوارے موجود ہیں جو ہر وقت پانی ہوا میں اچھال رہے ہوتے ہیں ۔ عام طور پر مقبرے عبرت کی جگہ ہوتے ہیں، لیکن یہ تو ایک تفریح کی جگہ ہے۔ یہاں پر لوگ فاتحہ خوانی کیلیے کم اور تفریح کے لیے زیادہ آتے ہیں۔ اگر میں اس جگہ کو ایک کمپلیکس کا نام دوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

انھی احساسات کے ساتھ میں اس عظیم عمارت کو دیکھنے چلا گیا۔ جب میں ایک بہت بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ کئی سو فٹ کے فاصلہ پر دوسرا بڑا گیٹ تھا۔ ان دونوں گیٹس کے درمیان ایک وسیع میدان تھا جس میں بے شمار درخت لگے ہوئے تھے۔ میرے خیال میں یہ جگہ ایک طرح سے پارکنگ اور استقبالیہ کے لیے

بنائی گئی ہو گی۔ دوسرے بڑے گیٹ کے بعد ایک بہت بڑے میدان کے درمیان میں وہ عمارت تھی جہاں ہمایوں کی قبر کے علاوہ اور بھی کئی قبریں ہیں۔ دور سے دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ درمیان میں واقع عمارت مقبرہ نہیں ہے بلکہ ایک بہت ہی خوبصورت محل ہے۔ جس کے چاروں طرف سے آپ اندر جا سکتے ہیں۔ یہ عمارت ایک وسیع میدان کے درمیان میں بنائی گئی ہے۔ اس کے چاروں طرف خوبصورت باغ اور باغیچے انتہائی خوبصورت نظارہ پیش کر رہے تھے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس عمارت کے آرکیٹیکٹ کا تعلق ایران سے تھا۔

یاد رہے کہ جب ہمایوں ایران سے واپس آیا تھا تو اس کے ساتھ بہت سے ایرانی آرکیٹیکٹ اور مختلف علوم کے ماہر بھی ساتھ آئے تھے۔ میرے خیال میں اسی دور میں ہندوستان کے اندر شیعہ مسلک کے لوگوں کا آنا جانا پہلے سے زیادہ ہوا اور ان کی مغل دربار تک رسائی ہوئی۔ ایران سے جو لوگ ہمایوں کے ساتھ آئے وہ عالم فاضل لوگ تھے اور مختلف علوم کے علم ماہر تھے۔ اس لیے وہ جلد ہی مغلوں کے قریب ہو گئے جس کی وجہ سے مغلوں کے معاملات پر ان کا گہرا اثر پڑا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کے بعد ہندوستان میں شیعہ مسلک کی ترویج میں بے حد اضافہ ہوا۔

یہ بات بھی آپ کی دلچسپی کا باعث ہو گی کہ آیت اللہ خمینی کے دادا کی پیدائش لکھنؤ کی ہے جو ریاست اودھ کی راجدھانی تھا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آباؤاجداد اس علاقہ میں کافی عرصہ قبل آکر آباد ہوئے تھے۔ ریاست اودھ کے حکمران شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور وہ اپنے مسلک کے فروغ کے لیے ایرانی علماء کو بلاتے رہتے تھے۔ خمینی صاحب کے آباؤاجداد بھی اسی سلسلہ میں ہندوستان آئے تھے۔

نا جانے کیوں مجھے ان باغات، باغیچوں اور بلند و بالا عمارتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ میری دلچسپی ان عمارتوں سے جڑی داستانوں میں ہوتی ہے، البتہ میں اُن کاریگروں کے فن کی تعریف ضرور کرتا ہوں جنھوں نے یہ کارنامے سرانجام دیے ہوتے ہیں۔ میں ان کے فن کی داد دیے بغیر نہیں رہتا۔ یہاں بھی میں نے ایسا ہی کیا۔

ایک کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے، مجھے گائیڈ نے بتایا کہ یہ وہ کمرہ ہے جہاں بہادر شاہ ظفر نے لال قلعہ سے آکر پناہ لی اور وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ کئی دن تک اس چھوٹے سے کمرے میں مقیم رہے۔ اب یہ کمرہ میرے لیے کمرہ نہیں رہا بلکہ تاریخ کا ایک گواہ بن گیا اور میں چشم تصور سے اس کمرے میں ایک تاریخی واقعہ دیکھتا رہا ۔جب ایک عظیم سلطنت کا سورج غروب ہو رہا تھا اور سات سمندر پار سے آکر انگریز قوم کا ایک نمائندہ ہڈسن، آخری مغل بادشاہ کو گرفتار کرتا ہے اور تھال میں اس کے بیٹوں کے سر پیش کرتا ہے۔

مجھے یہ بھی یاد آیا کہ جس کا یہ مقبرہ ہے حکومت چھن جانے کے باوجود اس نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ پندرہ سال تک ویران جنگلوں میں پھرتا رہا لیکن حوصلہ نہیں ہارا۔ پھر ایک دن اس نے اپنا کھویا ہوا تخت واپس لے لیا اور مغل سلطنت کو دوبارہ سے زندہ کیا۔اس نے ان افغانوں کو شکست دی جو کبھی اس کے ملازم تھے اور بعد میں اس کے دشمن بن گئے۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ شیر شاہ سوری ایک جنگ میں مارا جا چکا تھا اور اس کے بچوں میں اتنی بڑی سلطنت کو سنبھالنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ ہمایوں نے صرف تخت واپس ہی نہیں لیا بلکہ اس نے مغلیہ سلطنت کی نئے سرے سے بنیاد رکھی جو تین سو سال سے بھی زیادہ اس علاقے میں قائم رہی۔ اس دوران مغل حکمرانوں نے ہندوستان میں بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ کامیاب حکمرانوں میں چند نمایاں

نام اکبر، جہانگیر ، شاہ جہان ، عالمگیر کے ہیں اور آخری حکمران بہادر شاہ ظفر تھا۔ جنگ،آزادی کی ناکامی کے نتیجہ میں 1857 ء میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

پھر ایک فارسی کہاوت کے مطابق

ہر کمالے راز والے

ہمایوں کے ساتھ بد قسمتی یہ ہوئی کہ دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے بعد وہ صرف ایک سال تک زندہ رہا۔ یہ ایک قدرتی المیہ ہے۔ جس حکومت کو حاصل کرنے کے لیے اس نے پندرہ سال جدوجہد کی وہ اسے حاصل بھی ہوئی تو صرف ایک سال کے لیے۔ اس کی وفات کے بعد اکبر نے بھی سولہ سال کی عمر میں حکومت سنبھالی۔ یہ سب دیکھ کر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہمایوں مغلوں کے لیے دوسرا بابر ثابت ہوا۔

ہمایوں کے پاس واپس اپنے آبائی شہر فرزانہ، ازبکستان جانے کا موقع تھا اور یہی شیر شاہ سوری کی خواہش بھی تھی۔ لیکن ہمایوں نے دربدر ہونا تو پسند کیا لیکن ہندوستان کو چھوڑ کر جانے کا نہ سوچا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شیر شاہ سوری مسلسل ہمایوں کا پیچھا کرتا رہا اور اس دوران وہ خوشاب تک آیا۔ اس کی بد قسمتی یہ ہوئی کہ اس دوران بنگال میں اس کے خلاف بغاوت ہو گئی اور اسے واپس جانا پڑا، ورنہ وہ ہمایوں کو ہندوستان سے ضرور باہر کر دیتا۔ اسے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کے خواب نے ہی تباہ کیا۔

یہ کمپلیکس ہمایوں سے اس کی بیوی کی بے مثال محبت کی ایک نشانی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس مقبرے نے ہندوستان میں مغلوں کے ایک منفرد طرز تعمیر کی بنیاد رکھی۔ جو بعد میں ان کی پہچان بن گیا۔ ہمایوں کی بیگم نے اس کمپلیکس کی تعمیر کے لیے ایک ایرانی آرکیٹیکٹ مرزا غیاث کا انتخاب کیا۔ مرزا نے اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر اس کمپلیکس کو ڈیزائن کیا۔ یہ کمپلیکس اسی ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ اس جگہ کے انتخاب میں دو

باتیں پیشِ نظر رکھی گئیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے قریب دریا بہتا ہے اور دوسرا درگاہِ نظام الدین کی قربت۔ اس کمپلیکس کے ایک کونے میں وہ جگہ اب بھی محفوظ ہے جہاں پر حضرت نظام الدین اولیاء نے چلہ کاٹا تھا۔ یہ مغلوں کی مسلمان صوفیہ سے محبت کا ایک اظہار ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ مغلوں کی اکثر عمارتیں دریاؤں کے کنارے ہوتی ہیں جو ان کی دریاؤں سے محبت ظاہر کرتی ہیں۔

گائیڈ نے یہ بھی بتایا کہ مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد انگریزوں نے اس عمارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ کسی حد تک اسے سنبھالے رکھا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ مقبرہ نہیں تھا بلکہ ایک خوبصورت اور دیدہ زیب باغ کا ہونا تھا۔ گائیڈ نے اور بھی بہت ساری قبریں دکھائیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہاں پر ایک سو سے زائد قبریں ہیں۔ جس سے مجھے لگتا ہے کہ اس کمپلیکس کی تعمیر کے بعد دلی میں مغل خاندان کا یہ شاہی قبرستان تھا۔

میں فاتحہ خوانی کے بعد مقبرے کی مین بلڈنگ سے باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور کمپلیکس بھی تھا جس میں ایک بہت ہی خوبصورت عمارت تھی۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ بھی ایک مقبرہ ہے اور اس میں دفن شخص کا نام عیسیٰ خان نیازی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ شیر شاہ سوری ایک افغان تھا۔ افغان اور مغلوں کی آپس میں بیشمار جنگیں بھی ہوئیں۔ پانی پت کی پہلی جنگ میں بھی ایک طرف لودھی اور دوسری طرف بابر تھا ۔ اس طرح ہندوستان کی حکومت درحقیقت بابر نے افغانوں سے ہی چھینی تھی۔ عیسیٰ خان نیازی شیر شاہ سوری کے دربار کا اہم فرد تھا۔ اس کا مقبرہ بھی شیر شاہ سوری نے ہی بنوایا تھا۔ یہ عمارت بھی بے حد شاندار اور قابل دید ہے لیکن ہمایوں کے مقبرے کے مقابلے میں بہت چھوٹی ہے۔ یونیسکو (HERITAGEWORLDUNESCO) نے اس

کمپلیکس کو ایک قومی ورثہ قرار دیا ہو۔ اس کے کافی معلومات ان کی ویب سائٹ پر موجود ہیں[9]۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ عیسیٰ خان نیازی کا تعلق میانوالی کے علاقہ کالا باغ، عیسیٰ خیل میں بسنے والے نیازی قبیلہ سے ہی ہے۔ مجھے یقین تو نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کہیں پڑھا ہے کی عیسیٰ خیل شہر کا نام بھی لودھی اور شیر شاہ سوری کے دربار سے تعلق رکھنے والے عیسیٰ خان نیازی کے نام پر ہی رکھا گیا ہے۔

میں کچھ دیر کے لیے دور ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور یہ دیکھتا رہا کہ میرے دائیں طرف ایک افغان اور میرے بائیں طرف وسطی ایشیا سے آنے والے تیمور کی اولاد کا ایک مغل ہے۔ دونوں کا ایک ہی مقصد تھا، ہندوستان پر حکومت کرنا۔ دونوں باری باری ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔ آٹھ سو سال کے طویل عرصے میں شمالی اور وسطی ہندوستان کے علاقے میں شاید ہی کسی مقامی فرد کو کبھی حکومت کرنے کا موقع ملا ہو۔ حکومت کرنے کا حق صرف مغلوں، ترکوں، غوریوں، غزنویوں یا پختونوں کا تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ میرے خیال میں اس کی وجہ ان لوگوں کا جنگجوانہ رویہ تھا۔ یہ جنگجو دور دراز علاقوں سے آتے تھے۔ یہاں انھیں مذہبی یا قومی بنیاد پر کسی بھی طرح کی مقامی حمایت حاصل نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ اس علاقے پر قابض ہو گئے اور ایک طویل عرصہ تک حکمرانی کی۔

مقامی لوگوں کی ایک واضح اکثریت نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے اور ان کے درباری بن کر بیٹھے۔ پھر ایک اور صاحب سات سمندر پار سے تشریف لاتے ہیں اور آخری حکمرانوں کو باہر نکال کر اپنی حکومت قائم کرتے ہیں، ان کو ہم انگریز صاحب بہادر کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ بھی چار سو سال تک ہندوستان میں رہا۔ اس نے اپنی حکومت

---

http://www.kamit.jp/02_unesco/12_humayun/hum_eng.htm

کاآغاز چند تجارتی کوٹھیوں سے کیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ ہندوستان کے طول و عرض پر اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ باالآخر پھر مقامی لوگوں نے جمہوری طریقے سے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لیا اور آج اس خطے پر مقامی لوگ حکمران ہیں۔ بہت سے مقامی حکمرانوں کا تعلق بھی انھی سابقہ حکمرانوں کی نسلوں سے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان کا موجودہ حکمران؛ عمران خان نیازی بھی اسی عیسیٰ خان نیازی کی نسل سے ایک نیازی ہے۔ وہ کل بھی حکمران تھے، آج بھی ہیں اور حالات ایسے ہی رہے تو پرسوں بھی یہ ہی حکمران ہوں گے۔

اب کافی وقت ہو گیا تھا اور میں ایک جدو جہد کرنے اور کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے والے بادشاہ کے مقبرہ سے اس عظیم ہستی کے مقبرہ کی طرف چل پڑا جس کی حکومت آج بھی بے شمار دلوں پر قائم ہے جن کا نام ہے خواجہ نظام الدین اولیاء رحمت اللہ علیہ۔



Humayun Tomb Photo Credit:
https://www.britannica.com



Humayun Mughal King Photo Credit:
https://www.historyfiles.co.uk



At Humayun Maqbra

سید محمد نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی

سید محمد نظام الدین اولیاء ان بزرگان دین میں سے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں اشاعت اسلام میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھیں محبوب الٰہی بھی کہا جاتا ہے۔ آپ بدایوں میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد محترم آپ کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے ۔والد کی وفات کے بعد آپ کی والدہ آپ کو لے کر دلی آ گئیں۔آپ جوانی میں بابا فرید الدین المعروف گنج شکر کے مرید ہو گئے اور ہر سال رمضان کے مہینے میں اجودھن، موجودہ پاکپتن آتے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی ان کے مزار پر آتے ہیں اور ان سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

میں انھی عقیدت کے جذبات اور احساسات کے ساتھ ان کے مزار پر چلا گیا۔ ان کے مزار کو درگاہ کہتے ہیں۔ وہ علاقہ جہاں آپ کا مزار ہے، کو بستی نظام الدین کہتے ہیں۔ یہ ایک بہت وسیع علاقہ ہے۔ تبلیغی جماعت کا مرکز بھی اسی علاقے میں ہے۔ یہاں پر دلی کی میٹرو اور ریل کا سٹیشن بھی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ ہم بمبئ سے دہلی آئے تھے تو ٹرین کا آخری سٹیشن بستی نظام الدین ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو حضرت نظام الدین اولیاء کی زندگی سے متعلق کچھ باتیں بتاؤں، میں چاہوں گا کہ درگاہ پر جانے والے واقعے کی کچھ تفصیل آپ کے سامنے رکھوں۔

جب میں بستی نظام الدین کے علاقے میں داخل ہوا اور وہاں کا ماحول دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ علاقہ ایک غربت زدہ علاقہ ہے۔ گلیوں اور بازاروں کو دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ میں ایک نہایت ہی پسماندہ علاقے میں آ گیا ہوں۔ بہت سی تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا میں درگاہ کے مین گیٹ پر پہنچا۔ راستے میں صفائی ستھرائی کا نام و نشان نہیں تھا۔ یہ دہلی کا ایک مضافاتی علاقہ ہے لیکن اس کی دہلی سے کوئی نسبت نظر نہیں آ رہی تھی۔

جب میں درگاہ کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ کاریڈورز میں بہت سے لوگ لیٹے ہوئے ہیں جن کی اکثریت نے صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ میں ان کے پاس سے بہت مشکل سے گزرا۔ ایک چھوٹے سے صحن کے ایک طرف کمرہ میں حضرت نظام الدین اولیاء کی قبر مبارک ہے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ صحن میں دو تین جگہوں پر فربہ قسم کے لوگ مختلف ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنے سامنے ایک بڑا سا رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ جو آدمی بھی اندر آتا یہ اسے گھیر لیتے اور اس سے مطالبہ کرتے کہ ہم لوگ عرس کے موقع پر ایک بہت بڑی حلیم کی دیگ پکاتے ہیں آپ بھی اس میں اپنا حصہ ڈالیں اور بتائیں کتنے پیسے دیں گے تاکہ رجسٹرڈ میں ہم آپ کا نام لکھیں۔ یہ ایک طرح سے زبردستی کا منظر تھا۔

میرے لیے یہ ایک عجیب بات تھی۔ جب میں نے ایک صاحب سے معذرت کی تو انھوں نے بہت ہی بُرا منایا۔ میں نے ایک سے جان چھڑائی تو دوسرے گروہ کے لوگ آ گئے اور ان سے جان چھڑائی تو تیسرا گروپ آ گیا۔ اُن کا رویہ انتہائی جارحانہ تھا۔ وہ نہایت ہی اونچی زبان میں بات کر رہے تھے۔ مجھے لگا کہ وہ جو عقیدت جو میں حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں لے کر یہاں پر آیا تھا وہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ یہ عجیب و غریب منظر تھا جو مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے ان لوگوں سے جان چھڑوا کر چھوٹے سے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر دعا ئے مغفرت کی۔

درگاہ سے فارغ ہو کر میں امیر خسرو کے مزار کی طرف چلا گیا، جو اسی احاطہ کے ایک حصے میں واقع تھا۔ دور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہاں قوالی ہو رہی ہے جو میرے لیے حیران کن بات تھی۔ اس سے پہلے کہ میں آپکو امیر خسرو صاحب کے متعلق کچھ معلومات فراہم کروں، حضرت محمد نظام الدین اولیاء کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت

میں پیش کرنا چاہوں گا۔ یہ وہ ہستی ہیں جنہوں نے اسلام کی بے حد خدمت کی۔ ہندوستان بھر میں اسلام کی اشاعت میں ان کا حصہ قابلِ ذکر ہے۔

آپ کو عرف عام میں حضرت نظام الدین بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کا لقب محبوب الٰہی بھی بے حد مشہور ہے۔ آپ کی پیدائش تیرویں صدی کی تیسری دہائی میں اتر پردیش میں ہوئی۔ آپ ہندوستان میں چشتیہ سلسلہ کے ایک بڑے صوفی اور بزرگ مانے جاتے ہیں۔ آپ سے پہلے فرید الدین گنج شکر، قطب الدین بختیار کاکی اور معین الدین چشتی، چشتیہ سلسلہ کی نامور شخصیات ہیں۔

آپ کی تعلیمات کی بنیاد بھی محبت ہی ہے۔ اسی ذریعہ کو آپ نے خدا کو پہچاننے کا ایک راستہ بتایا ہے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ خدا سے محبت کا صحیح طریقہ، انسانیت سے محبت کے اظہار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب ابھی آپ کی عمر پانچ سال کی تھی کہ آپ کے والد وفات پا گئے۔ آپ کی والدہ آپ کو لے کر دلی آ گئیں۔ آپ جب بڑے ہوئے تو آپ صوفی بزرگ فرید الدین گنج شکر کے مرید بن گئے۔ وہ ہر سال رمضان کا مہینہ اجودھن میں اپنے پیر کے پاس گزارتے تھے۔ بابا فرید نے انھیں اپنا جانشین بھی مقرر کیا تھا۔

انھوں نے دلی سے ہٹ کر ایک علاقے میں رہنا شروع کیا اور اپنی خانقاہ بنائی۔ اس خانقاہ میں ہر آنے والے شخص کو کھانا دیا جاتا تھا۔ جسے آپ لنگر کہہ سکتے ہیں جو بعد میں ہر خانقاہ کا ایک لازمی جزون گیا۔ آپ کے شاگرد کافی مشہور ہوئے جن میں امیر خسرو کا نام سرِفہرست ہے۔ پاکستان میں کئی لوگ اپنے نام کے ساتھ نظامی لکھتے ہیں جس کی وجہ آپ کی ذات ہی ہے۔ آپ کے بارے میں مزید معلومات آپ کو خلیق احمد نظامی کی کتاب The Life and times of Shaikh Nizam-u'd-din Auliya میں

مل سکتی ہے۔ یہ کتاب آپ کی زندگی کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں میں سے اہم سمجھی جاتی ہے۔

امیر خسرو: ایک عظیم صوفی شاعر، ذہین موسیقار اور اردو زبان کا بانی

جب بھی میں نے حضرت امیر خسرو کا نام سنا تو میرے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ موسیقی کے چند آلات بنانا اور چند نئی دھنیں ایجاد کرنا ہے۔ جب میں نے ان کے مزار پر قوالی ہوتے دیکھی اور مختلف لوگوں کو ان کے بنائے ہوئے موسیقی کے آلات کے ساتھ دیکھا تو میرا یہ خیال مزید پختہ ہو گیا۔

وہاں پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی مجھے اپنی مخصوص وضع قطع سے فن موسیقی سے وابستہ ہی لگے لیکن جب میں نے امیر خسرو کے متعلق پڑھا تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ ان کے متعلق پتہ چلا کہ وہ تو ایک بہت بڑے صوفی تھے اور خواجہ نظام الدین کے انتہائی قریبی مرید بھی تھے۔ خواجہ صاحب نے ان سے متعلق یہ کہا تھا کہ اگر شریعت کی اجازت ہوتی تو میں انھیں اپنی قبر میں دفن کرنے کے لیے کہتا۔ خواجہ صاحب کی وفات کے چند ماہ بعد ہی امیر خسرو کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہ چند ماہ بھی انھوں نے نہایت خاموشی سے گزارے، وہ ہر وقت ایک افسردگی کے عالم میں رہتے۔ یہ سب ان کی اپنے مرشد سے محبت کی وجہ سے تھا۔

امیر خسرو کا اصل نام عین الدین اور ابوالحسن ان کی کنیت تھی ۔ مختلف مسلمان بادشاہوں نے آپ کو امیر خسرو اور ان جیسے کئی دوسرے القابات سے نوازا تھا۔ آپ کے والد ترک تھے جو اپنے آبائی علاقہ ثمرقند سے نقل مکانی کرکے ہندوستان آ گئے تھے۔ امیر خسرو، پٹیالی، اترپردیش میں تیرویں صدی کے وسط میں پیدا ہوئے۔ آپ کی

والدہ ایک ہندو خاندان سے تھیں۔ یہ بات مجھے خاص ا حیران کرتی ہے کہ بہت سے اثر و رسوخ رکھنے والے مسلمانوں، خاص طور پر مسلمان حکمرانوں کی بیویاں ہندو خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس سے لگتا ہے کہ یہ ایک عام رواج تھا کہ لوگ ہندو خاندان میں شادیاں کرتے تھے۔

امیر خسرو کی والدہ بھی ایک ہندو راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جب آپ آٹھ سال کے ہوئے تو آپ کے والد وفات پا گئے۔آپ کی والدہ اپنے بچوں کو لے کر اپنے والد کے گھر دہلی آ گئیں۔ جب امیر خسرو بیس سال کے ہوئے تو آپ کے نانا بھی فوت ہو گئے اور یوں آپ اپنے بڑوں کی شفقت سے محروم ہو گئے۔

جو بات مجھے سب سے زیادہ حیران کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اُس دور میں جب سفر کرنا بے حد مشکل تھا امیر خسرو نے اس قدر علم کیسے حاصل کیا اور کس طرح سے انھوں نے اس اپنے علم کی بدولت نت نئ چیزیں ایجاد کرکے لوگوں کو حیران کیا۔ وہ بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں۔ طبلہ اور سارنگی انھی کی ایجاد ہے۔ وہ قوالی کے بھی بانی مانے جاتے ہیں۔ ایک اور بات جو ان سے متعلق کہی جاتی ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں شعر لکھا۔

امیر خسرو کی مادری زبان فارسی تھی۔ میں نے یہ بات کئ جگہ پڑھی ہے اور سنی بھی ہے کہ اُس وقت ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں ایک زبان بولی جاتی تھی جسے ہندوستانی زبان کہا جاتا تھا۔ یہ زبان سنسکرت سے خاصی مختلف تھی۔ جو لوگ یہ زبان بولتے تھے انھیں عام طور پر ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور اسی ہندوستانی زبان کے ملاپ سے اردو زبان کی بنیاد رکھی گئ۔ بہت سارے لوگ امیر خسرو کو اردو زبان کا بانی کہتے ہیں اور انھیں طوطی ہند کا لقب بھی دیا گیا ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ زبان کسی خاص تاریخ کی ہی ایجاد ہو۔ یہ ایک عوامی معاملہ ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ ایک اور بات بھی آپ کی دلچسپی کے لیے بڑی اہم ہوگی کہ جس طرح خواجہ نظام الدین کا عرس منایا جاتا ہے اسی طرح سے ان کا عرس بھی باقاعدگی سے منایا جاتا ہے۔ ایک بڑا طبقہ ان کو پیر بھی مانتا ہے اور انھیں لوگ خواجہ امیر خسرو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

میں ان ہی خیالات میں خواجہ امیر خسرو کی قبر مبارک کے پاس چلا گیا۔ قبر کے چاروں طرف جالی لگی ہوئی تھی اور اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ زیادہ تر لوگ چادریں چڑھا رہے تھے اور کچھ لوگ وہاں پر پہلے سے موجود چادریں لے کر جا رہے تھے۔ میں کافی دیر وہاں بیٹھا قوالی سنتا رہا۔

قوالی کبھی ہمارے ہاں بھی بہت سنی جاتی تھی۔ ہر گلی محلے میں کسی نہ کسی پیر کا مزار ہوتا تھا اور ان کے عرس کے موقع پر قوال، قوالی پیش کرتے تھے لیکن اب آہستہ آہستہ قوالی کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔ نصرت فتح علی خاں صاحب نے قوالی کے فن کو عروج تک پہنچانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں امیر خسرو کے مزار پر بیٹھا قوالی سن رہا تھا تو میں یہ دیکھ رہا تھا کہ قوال بار بار ہاتھوں سے امیر خسرو کے مزار کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور انھی کی لکھی ہوئی کوئی قوالی گا رہے تھے۔ وہ منظر مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ میرے بھارت کے دورے کا یہ ایک اہم واقعہ تھا جو مجھے اب تک یاد ہے ۔ آپ تصور کریں کہ آپ قوالی سن رہے ہوں اور ان کی قبر بھی سامنے ہو جنھوں نے قوالی ایجاد کی ہو، تو اس منظر کا ناقابل فراموش ہو جانا تو بنتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہاں پر کوئی حلیم کی دیگ پکانے کے لیے پیسے نہیں لے رہا تھا۔

امیر خسرو سے متعلق پڑھنے کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ایک بہت ہی عظیم صوفی تھے اور جنھوں نے اردو اور فارسی ادب میں بے حد اہم کام سرانجام

دیے۔ آج آٹھ سو سال بعد بھی ان کے اشعار زبان زدِ عام ہیں۔ یہ اشعار ان ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

خسرو دریا پریم کا اُلٹی واکی دھار

جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا اس پار

امیر خسرو نے بے شمار کتابیں بھی لکھیں، غزلیں بھی کہیں۔ ان کے کام کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہر فن مولا تھے۔ ان کے مزار پر جانے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ ان کی اصل شناخت ایک شاعر اور ایک مصنف کی ہے جنھوں نے اردو جیسی خوبصورت اور عظیم زبان کی بے حد خدمت کی لیکن قوال حضرات نے ان کی پہچان قوالی ایجاد کرنے والے ایک موسیقار کے طور پر کروائی ہے۔

انھی خیالات کے ساتھ میں ان کے مزار سے واپس آگیا اور احاطے کے باہر کھلے میدان میں ایک چار دیواری کے اندر مرزا غالب کی قبر کے پاس چلا گیا۔ اس وقت اس احاطے میں صرف انھی کی اکیلی قبر تھی جس کے اوپر کوئی چھت وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اب میں نے تصاویر میں دیکھا ہے کہ اُن کی قبر پر ایک کمرہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ اب اِس بادہ خوار کا مزار دو عظیم مزاروں کے قریب موجود ہے۔ ابھی اس پر عرس شروع نہیں ہوا۔ ایک بات جو میرے لیے حیران کن تھی کہ مرزا غالب جن کا انتقال ڈیڑھ سو سال پہلے ہوا تھا کو دلی شہر میں دفن کرنے کی بجائے دلی سے باہر بستی نظام الدین میں دفنایا گیا۔ یقیناً اس کی وجہ اُس وقت بھی لوگوں کی حضرت نظام الدین سے عقیدت ہی ہوگی۔ برٹانیکا انسائکلوپیڈیا میں امیر خسرو کے بارے میں ایک مختصر تحریر موجود ہے[10]۔ اس کے علاوہ

[10] https://www.britannica.com/biography/Amir-Khosrow

امیر خسرو دہلوی نے بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے Amir Khusrau: Memorial Volume جسے مشی گن یونیورسٹی نے چھاپا ہے۔ اس میں امیر خسرو کے بارے میں کافی تفصیل سے لکھا گیا ہے[11]۔

امیر خسرو کے کلام کے چند نمونے

خسرو دریا پریم کا الٹی واکی دھار

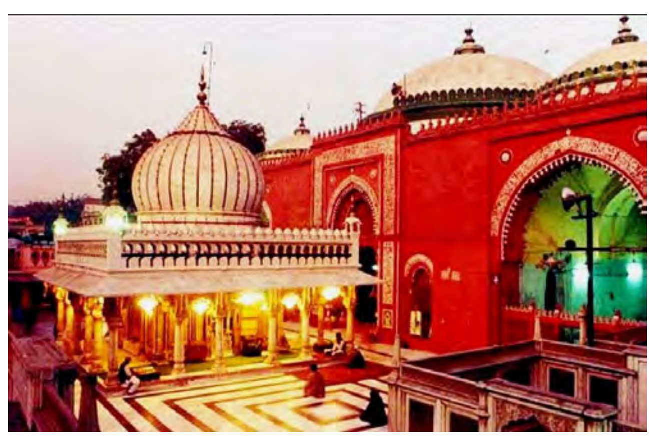
جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا اس پار

خسرو دریا پریم کا الٹی واکی دھار

جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا اس پار

گوری سووے سیج پہ مکھ پہ ڈالے کھیس

چل خسرو گھر اپنے، سانجھ بھئ چو دیس



Chishti Sufi saints, Nizamuddin Auliya
Photo Credit: https://www.thesufi.com

[11] https://books.google.com.pk/books?id=Ka_nKgqedWEC&q=amir+turkish+languages&redir_esc=y

نئی دہلی: حکمرانوں کا علاقہ جو عوام سے مختلف ہے

میرا آج کا دن مزارات پر گزرا، پہلے ہمایوں کا مقبرہ, پھر درگاہ نظام الدین، اس کے بعد امیر خسرو اور غالب کی قبریں۔ دن میں میرا رابطہ رنبیر سنگھ مانگٹ صاحب سے ہو گیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ میں آپ کو شام کے بعد نئی دہلی میں واقع اہم عمارات کی سیر کے لیے لے کر جاؤں گا۔ میں نے ان سے فرمائش کی کہ میں راشٹر یہ پتی بھون یعنی صدارتی محل، پارلیمنٹ ہاؤس اور انڈیا گیٹ ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے بتایا کہ رات کے وقت بہت اچھی روشنی ہوتی ہے اور زیادہ رش بھی نہیں ہوتا اس لیے ہم شام کے بعد ان مقامات پر جائیں گے۔

رنبیر صاحب مغرب کے بعد تشریف لے آئے۔ میرا ہوٹل ان مقامات سے زیادہ دور نہیں تھا اس لیے ہم جلد ہی نئی دہلی کے اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں بھارتی حکومت کے مرکزی دفاتر اور صدارتی محل کے ساتھ پارلیمنٹ ہاؤس بھی ہے۔ یہ ایک وسیع و عریض علاقہ ہے۔ یہاں بے شمار کھلی سڑکیں ہیں اور بہت ہی خوبصورتی سے سجائے ہوئے لان ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں حکومت کے مرکزی پروگرام بھی منعقد ہوتے ہیں۔

ہم سب سے پہلے پارلیمنٹ ہاؤس کی بلڈنگ کی طرف گئے۔ اس وقت امن و امان کی صورتحال بہت بہتر تھی اس لیے ہمیں اس عمارت کے قریب جانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ یاد رہے کہ 1911ء تک برٹش انڈیا کے مرکزی دفاتر کلکتہ میں تھے۔ بعد میں میں یہ دفاتر دہلی منتقل کیے گئے۔ اس وقت دہلی میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں مرکزی دفاتر کے لوگ بیٹھ سکیں۔ اس لیے عارضی طور پر شام ناتھ کے علاقے میں پہلے سے قائم چند عمارتوں میں مرکزی دفاتر قائم کیے گئے۔ اس وقت کا وائسرائے بھی انھی دفاتر میں بیٹھتا تھا۔

ہندوستان بہت بڑا ملک تھا اس وقت اس کی سرحدیں افغانستان سے نیپال اور برما تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ہمالیہ اور دوسری طرف بحر ہند تھا۔ اتنے بڑے ملک کو سنبھالنے کے لیے مرکزی دفاتر اور مختلف پروگرامات کے لیے ایک بڑی جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انگریز حکمرانوں نے 1912ء میں نئی دہلی کی تعمیر کا فیصلہ کیا۔ اس سے پہلے اس نام کا کوئی علاقہ موجود نہیں تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے پارلیمنٹ ہاؤس بنانے کا منصوبہ بنایا گیا۔

بھارت کا یہ پارلیمنٹ ہاؤس ایک گول شکل میں ہے۔ درمیان میں بہت بڑا ہال ہے اور ارد گرد بے شمار کمرے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مدھیہ پردیش میں گیارہویں صدی کا ایک مندر ہے جو گول شکل کا ہے۔ نئی دہلی کے ماہرین تعمیرات نے بھی پارلیمنٹ ہاؤس کا ڈیزائن اُسی سے ملتا جلتا بنایا ہے۔ یہ محض اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماہرین ایک ہزار سال پرانی عمارت کی طرزِ تعمیر سے متاثر ہو گئے ہوں۔

رنبیر صاحب اور میں اس عمارت کے بہت قریب چلے گئے۔ رات کا وقت تھا اور روشنی بھی بہت زیادہ تھی۔ مجھے اس عمارت کی طرزِ تعمیر نے بے حد متاثر کیا۔ میں سوچتا رہا کہ یہ وہ عمارت ہے جہاں انگریز امپیریل لیجسلٹو کونسل، انڈین لیجسلٹو کونسل اور کونسل آف سٹیٹس کے اجلاس منعقد کرتے تھے اور ایک محکوم قوم کی قسمت کے فیصلے کرتے تھے۔ پورے ملک سے انگریزوں کے وفادار اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے ان کونسلز کے ممبر بنائے جاتے تھے اور وہ یہاں پر ہونے والے اجلاسوں میں آتے تھے۔ میں تصور ہی میں یہ دیکھ رہا تھا کہ کس طرح سے راجے، مہاراجے دور دراز کا سفر کرکے اپنے غیر ملکی آقا کی خدمت میں پیش ہوتے تھے۔

اس عمارت کا افتتاح 1927ء کو کیا گیا یہ وہ دور تھا جب آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ یہ عمارت تحریک آزادی کی عینی شاہد ہے۔ یہ وہی عمارت ہے جہاں

موتی لال نہرو بھی آتا تھا، گاندھی بھی آیا ہوگا، قائدِاعظم بھی بارہا یہاں تشریف لائے ہوں گے۔ اگر آپ کو یاد ہو 1929ء میں بھگت سنگھ اور اس کے ایک ساتھی نے اس عمارت پر حملہ کیا تھا۔ یہ عمارت اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس نے تحریکِ آزادی کو کامیاب ہوتے دیکھا۔ اسی عمارت میں آزادی کے بعد کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا، جس طرح کراچی میں سندھ اسمبلی کی عمارت میں پاکستان کی کا پہلا اجلاس منعقد کیا گیا تھا۔

اب اس جگہ لوک سبھا اور راجیہ سبھا یعنی قومی اسمبلی اور سینیٹ کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں۔ اس عمارت میں آٹھ سو لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ میں دیر تک عمارت کے پاس کھڑا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ یہ وہ عمارت ہے جو ہمارے غیر ملکی حکمرانوں نے بنائی۔ اِس شہر میں میں ایک لال قلعہ بھی بنایا گیا تھا جس کے بنانے والے بھی غیر ملکی ہی تھے۔ اس پورے عرصے میں ہم کہاں تھے۔ اُس وقت ہمارے دیسی حکمران درباری کہلاتے تھے اور اب وہ ممبر پارلیمنٹ کہلاتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پھولن دیوی بھی اسکی ممبر تھیں اور وہ بھی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے قانون سازی میں حصہ لیتی تھیں اور اب ارب پتی لوگ غریبوں کی قسمت کے فیصلے کرتے ہیں۔

یہ طبقاتی خلیج ازل سے ہے اور شاید کبھی ختم نہ ہو۔۔۔ کبھی بادشاہ کے نام پر اور کبھی جمہوریت کے نام پر!

مجھے اس عمارت کو دیکھ کر یہ خیال بھی آیا کہ ہر ملکی اور غیر ملکی حکمران نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے اس عمارت کی مضبوط دیواروں کا سہارا لیا۔ موجودہ حکمران بھی یہیں پر تشریف فرما ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ جو حال دہلی شہر کے باقی حصے کا ہے، اس سے تو لگتا ہے کہ وہ دہلی کا حصہ ہی نہیں ہیں۔ اگر یہ وہ حصہ نہیں ہے تو یہاں بیٹھنے والے لوگ بھی ان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ انھیں اس جمہوری دور میں ان کا ووٹ درکار ہوتا ہے اور ضرورت کے وقت ان کا خون بھی۔

اِس عمارت کے ارد گرد ہر جگہ انتہائی خوبصورت روشنیوں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم بہت ہی حسین و جمیل اور وسیع میدان میں آ گئے ہیں۔ یہ ظاہری فرق اس فرق کو بھی ظاہر کرتا ہے جو حکمرانوں اور عام آدمی کی زندگی میں پایا جاتا ہے۔

میں اور رنبیر صاحب انھیں راستوں پر چل کر واپس آ گئے جن راستوں پر پر یہاں کا وائسرائے چل کر آتا تھا۔ اس عمارت کی سیر کے بعد میں ایڈون اور ہربرٹ، جنھوں نے اس عمارت کا ڈیزائن بنایا تھا، کے ہنر کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس عمارت کی تعمیر کرنے والے کاریگروں نے بھی کمال کیا ہے۔ یقیناً یہ ایک شاہکار عمارت ہے۔ اس عمارت کا ایک تفصیلی تعارف ایک کتاب کی شکل میں پارلیمنٹ کے دفاتر نے چھاپی ہے ۔[12]

ہماری اگلی منزل بادشاہ کا محل تھا جسے اب جمہوری دور میں ہم صدارتی محل کہتے ہیں !

پہلے وائسرائے ہند کی رہائش گاہ اور اب راشٹر یہ پتی بھون

انگریزوں نے 1911 ء میں دلی میں منعقدہ ایک تاریخی دربار میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ حکومت کے مرکزی دفاتر کلکتہ سے دلی منتقل کیے جائیں۔ یاد رہے کہ کلکتہ کے نواحی علاقے راج بھون میں وائسرائے کی رہائش اور دفاتر تھے۔ انگریز سرکار کا خیال تھا کہ اتنے بڑے ملک کو کسی کونے میں بیٹھ کر کنٹرول نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اس کام کے لیے ان کے نزدیک سب سے بہترین جگہ دلی تھی۔ اس سے پہلے بھی دلی بے شمار حکمرانوں کا پایہ تخت رہ چکا تھا۔ دلی کے علاوہ بھی کئی شہر حکمرانوں کے پایہ تخت رہ چکے ہیں، جن میں لاہور اور آگرہ بھی شامل ہیں۔ اس کے باوجود انگریز سرکار نے دلی ہی کو اپنے مرکزی

---

[12] https://rajyasabha.nic.in/rsnew/Parliament_of_India.pdf

دفاتر کے لیے پسند کیا۔ اس طرح دلی میں ایک "نئی دہلی" نام کا شہر بسانے کا فیصلہ ہوا جس میں صرف حکمرانوں، ان کے ساتھیوں اور رکھوالوں کو رہنے کی اجات دی جائے گی۔

یاد رہے کہ 1858ء سے پہلے تک ہندوستان پر کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی کا تھا اور اس کے سربراہ کو گورنر جنرل انڈیا کا خطاب دیا جاتا تھا۔ بعد میں جب ہندوستان پر براہ راست برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی۔ برطانوی سلطنت کے نمائندے کو وائسرائے آف انڈیا کہا جاتا تھا۔

یہ بات انتہائی دلچسپی کا باعث ہے کہ بھارت کا صدارتی محل دنیا کا سب سے بڑا صدارتی محل ہے۔ میں رنبیر سنگھ مانگٹ صاحب کے ساتھ راج پاتھ پر چل رہا تھا۔ ہمارا رخ صدارتی محل کی طرف تھا۔ ہم اس کے بہت قریب تو نہ جاسکے لیکن کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس کا نظارہ ضرور کیا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ انتہائی پرسکون ماحول تھا۔ اس وقت انتارش بھی نہیں تھا اور آسمان بھی صاف ہونے کی وجہ سے صدارتی محل واضح نظر آرہا تھا۔

اس عظیم عمارت کے تین نام ہیں، پہلا نام تو وائسرائے کی رہائش گاہ تھا، پھر اسے صدارتی محل کہا جانے لگا اور اب اسے راشٹرپتی بھون یعنی صدر کی رہائش گاہ کہتے ہیں۔ میں اس عمارت کا گنبد دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ بہت ہی خوبصورت بیلنس تھا، اس گنبد کے دائیں اور بائیں بے شمار عمارتیں تھیں۔ سامنے گراؤنڈ کے اندر ایک بہت بڑا پول تھا جس پر بھارت کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جتنی دہشت اور ہیبت، یہ میں الفاظ جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں، اس عمارت کی مجھ پر ہوئی اور اور کسی چیز کی نہیں ہوئی۔ میں آج تک اس عمارت کی وسعت اور خوبصورتی کی ہیبت محسوس کرتا ہوں۔

مجھے کسی نے بتایا تھا کہ انگریز عمارات کی طرز تعمیر میں اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ جو بھی وہاں پر آئے وہ لازماً مرعوب ہو۔ میرا خیال ہے کہ ہر بادشاہ کی ایسی ہی سوچ ہوتی ہے۔ میں نے رنبیر صاحب سے پوچھا کہ کیا ان کو کبھی اندر جانے کا موقع ملا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ پھر میں نے اندر کی تفصیلات پوچھیں، تو انھوں نے ایک ہی فقرہ کہا کہ جتنا سندر یہ باہر سے ہے، اس سے کہیں زیادہ سندر یہ اندر سے ہے۔

ہر محل کے نیچے کسی غریب کی جھونپڑی ضرور ہوتی ہے!

جب انگریز سرکار نے اس علاقے میں ایک نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیا تو اس کے لیے انھوں نے یہاں پر موجود دو گاؤں ختم کر دیے۔ ان غریب کسانوں کی زمین ہتھیانے کے لیے لینڈ ایکوزیشن ایکٹ 1894ء کے تحت کارروائی کی گئی۔ اس ایکٹ کے تحت سرکار کسی کی بھی زمین کو سرکاری استعمال کے لیے مارکیٹ ریٹ سے کم ریٹ پر لے سکتی ہے۔ ان دو دیہات کا رقبہ چار ہزار ایکڑ یعنی 160 مربع زمین تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس زمین کے ساتھ ساتھ مغل دور کے باغات تھے جو اپنی نوعیت کے انتہائی منفرد باغات تھے اور وہ آج بھی موجود ہیں۔ ان کو مغل باغات کہا جاتا ہے۔ آج بھی ان کی شان و شوکت کا کوئی مقابلہ نہیں۔

اس کے ساتھ زمین پر ایک چھوٹا سا ٹیلہ بھی تھا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ وائسرائے کا گھر ایسی جگہ پر ہو جو ہر طرف سے لوگوں کو نظر آئے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ محل کے لیے کونسی جگہ مناسب ہوگی؟ کتنی جگہ درکار ہوگی؟ راستہ کس طرف سے ہو؟ ڈھلوان کتنی رکھی جائے؟ ان سب معاملات پر ایک طویل بحث ہوئی۔ اگر آپ کو موقع ملے تو آپ یہ دلچسپ بحث ضرور پڑھیں۔

اس محل کے ڈیزائن کی ذمہ داری EdwinLutyens کو دی گئی جو اُس وقت انگلینڈ میں بھی ایک محل بنا رہا تھا۔ اس نے رضاکارانہ طور پر یہ ذمہ داری ادا کی اور اس کام

کے لیے کوئی رقم نہیں لی لیکن جو کام اس نے کیا وہ کمال تھا۔ اس نے وائسرائے کی رہائش کے لیے 320 ایکڑ جگہ مختص کی اور تین سو چالیس کمرے بنائے۔ اس عمارت کا کل کورڈ ایریا دو لاکھ مربع فٹ ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز 1912ء میں ہوا اور سترہ سال کی مدت یعنی 1929ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس وقت کا وائسرائے، لارڈ آرون پہلا شخص تھا جس نے اس عظیم الشان محل میں رہائش اختیار کی۔ یہ عمارت انگریزوں کی شان و شوکت کو ظاہر کرتی ہے کہ انھوں نے اپنی شان و شوکت کے اظہار اور اپنی خوشی کی لیے کتنی بے دردی سے غریب اور غلام عوام کا کثیر سرمایا خرچ کیا۔۔۔

یہ سب اس لیے ہوا کہ اس ملک پر ان کا غاصبانہ قبضہ تھا اور وہ حاکم تھے باقی سب محکوم۔

میں عمارت کے بہت قریب تو نہ جا سکا۔ اگر جا پاتا تو ضرور کسی غریب کسان کی جھونپڑی کے آثار دیکھ پاتا کہ جس کی چھت پر اس محل کی بنیاد رکھی گئی۔ میں صرف تصور ہی میں وائسرائے کی سواری اور اہل ہند پر مشتمل محافظ دستہ دیکھ رہا تھا کہ کس طرح وہ چند روپوں کی خاطر ایک غیر ملکی حکمران کی حفاظت کے لیے اپنی جان بھی دینے کو تیار تھے۔۔۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔۔۔ پہلے وہ افغان اور وسط ایشیا کے حکمرانوں کے لیے بھی یہی کام کرتے تھے۔ اپنوں کی حفاظت کا کام تو انھوں نے ایک ہزار سال پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ہندوستان بھر کے راجے اور مہاراجے اس وقت کے وائسرائے کی خدمت میں پیش ہو کر اپنی وفاداری کا ثبوت تحائف کی شکل میں پیش کر رہے تھے۔

ایک خوبصورت بات جو مجھے آج بھی بہت اچھی لگتی ہے وہ یہ ہے کہ جب 1947ء میں انگریزوں کا آخری وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن جو صرف پانچ ماہ تک وائسرائے رہا چلا گیا اس کے بعد بھارت کا پہلا گورنر جنرل چکروتی راجا گوپال چاری بنا،

جس نے اس عمارت میں رہائش رکھی۔ راجا صاحب نے سب سے پہلا جو کام کیا، وہ بہت ہی خوبصورت کام ہے، جس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ انھوں نے اس بڑی عمارت کے ایک چھوٹے سے حصے کو جس میں صرف چند کمرے تھے فیملی ونگ کا نام دیا اور وہاں پر رہائش رکھی اور باقی تمام عمارت سے کوئی بھی سروکار نہیں رکھا اور یہ روایت آج بھی ہے۔ بھارت کا صدر اسی فیملی ونگ میں رہتا ہے۔ اس کے بعد 1950ء میں راجندرہ پرساد پہلے بھارتی صدر ہیں جنھوں نے اس عمارت میں رہائش رکھی۔

جب میں اس صدارتی محل کو دیکھتا ہوں جسے انگریزوں نے ڈیزائن کیا اور پھر پاکستان کے صدارتی محل کو بھی سامنے رکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انگریزوں نے اس عمارت کو بناتے ہوئے ہندوستان کی مختلف عمارتوں کے طرز تعمیر کو بھی ذہن میں رکھا۔ اسی طرح کے رنگ استعمال کیے۔ اسکے علاوہ بھی آپ اور بہت ساری مماثلت محسوس کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اسے غور سے دیکھیں تو اس عمارت میں زیادہ تر سرخ رنگ ہی استعمال ہوا ہے۔ اس طرح اور بھی بہت سارے مقامات پر انھوں نے ہندوستانی طرز تعمیر اپنایا ہے۔

صدارتی محل کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے ہندوؤں، مغلوں اور یورپی طرزِ تعمیر کو مکس کرکے اس عمارت کو بنایا ہے۔ دوسری طرف اگر آپ پاکستان کی قومی اسمبلی کی عمارت یا پرائم منسٹر ہاؤس یا صدارتی محل دیکھیں تو یہ لگتا ہے کہ ان عمارتوں کی کسی بھی طرح مقامی طرز تعمیر سے کوئی مماثلت نہیں ہے۔ اس محل کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں ہمیشہ سے ہی بہت پڑھے لکھے لوگ رہائش پذیر رہے ہیں جو سیاسی تو نہیں ہوتے تھے لیکن انھوں نے اپنے کسی فن یا علم سے لوگوں کی قابلِ ذکر خدمت کی ہوتی تھی۔ اس عمارت کی ایک مختصر تاریخ جگران جوش نے The history of Rashtrapati Bhavan : The official home of the President of India

کے نام سے لکھی ہے جس میں کافی دلچسپ معلومات دی گئیں ہیں[13]۔



India President House Photo Credit:
https://news.abplive.com

شاہی دستہ اور بادشاہ

اب بہت وقت گزر چکا تھا اور ہمیں ایک تیسری عمارت بھی دیکھنا تھی، جس کا نام انڈیا گیٹ ہے۔ آگے چلنے سے قبل میں ایک اور بات کا ذکر یہاں ضرور کرنا چاہوں گا جو کچھ لوگوں کے لیے نہایت ہی دلچسپی کا باعث ہو گی، وہ بھارتی صدر کا باڈی گارڈ دستہ ہے۔

مغلوں کے دور سے ہی بڑے قد کاٹھ کے خوبصورت نوجوان بادشاہ سلامت کے ذاتی باڈی گارڈ ہوتے تھے۔ جب بھی بادشاہ سلامت ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تو یہ لوگ ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ ان کا مقصد حفاظت سے زیادہ بادشاہ کی شان و شوکت میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔ مغل بادشاہوں کا بھی ذاتی محافظ دستہ ہوتا تھا۔ انگریزوں نے

---

https://www.jagranjosh.com/general-knowledge/the-history-of-rashtrapati-bhavan-the-official-home-of-the-president-of-india-1343022754-1 [13]

بھی مغل بادشاہ کی طرز پر 1773ء میں اپنے گورنر کے لیے باڈی گارڈ یونٹ بنائی۔ یاد رہے اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی ایک خاص علاقہ تک محدود تھی اور مغل سلطنت کسی نہ کسی انداز سے قائم تھی۔ اس لحاظ سے یہ اب تک کی سب سے پرانی یونٹ ہے۔ اس یونٹ کی عمر دو سو سال سے زائد ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ بڑی اہم بات ہے۔

اس یونٹ میں ہندوستان کے خاص علاقوں سے مخصوص نسل کے لوگوں کو بھرتی کیا جاتا ہے۔ مختلف اوقات میں بھرتی کرنے کا معیار مختلف رہا لیکن ایک بات مشترک تھی کہ ہر شخص کا قد چھ فٹ تین انچ ہونا چاہیے۔ اس میں شامل لوگوں کی تعداد میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی، مختلف قوموں کا کوٹہ بھی تھا۔ اب اس یونٹ میں صرف ہندو جاٹ اور راجپوت ہی شامل ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ وفاداری اور ایک وجیہ شباہت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ روایت ابھی بھی جاری ہے۔ اس وقت اس دستے میں صرف پنجاب سے تعلق رکھنے والے جاٹ اور راجپوت بھرتی کیے جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر حصہ مالوہ اور ماجہ کے سکھ جاٹوں کا ہے۔

اس وقت اس میں دو سو گھڑ سوار ہیں جو گھوڑوں پر سوار ہو کر پریڈ میں شریک ہوتے ہیں۔ کسی دور میں یہ اونٹوں پر سوار ہوتے تھے۔ یہ ایک بہت خوبصورت سلسلہ ہے جو نسل در نسل چلتا آرہا ہے۔ بادشاہ سلامت کی حفاظت سے زیادہ بادشاہ سلامت کے وقار میں اضافہ کرنا اس یونٹ کا فرض ہے، جیسے بادشاہ کا لباس اور سواری اس کی شان و شوکت کو ظاہر کرتی ہے اسی طرح یہ دستہ بھی بادشاہ کی شان و شوکت میں اضافہ کے لیے رکھا جاتا ہے۔

اگر آپ نے اس دستے کی شان و شوکت دیکھنی ہو تو آپ بھارتی صدر کے کسی بھی پروگرام میں اس کی آمد و رفت دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اس دستہ کی موجودگی میں بادشاہ جیسا بھی ہو، اس کے قد کاٹھ میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ شاہی دستہ کی

ایک طویل تاریخ ہے جس کے بارے میں قدرے تفصیل سے اشوک ناتھ نے اپنی کتاب Izzat: Historical Records and Iconography of Indian Cavalry Regiments, 1750-2007 میں لکھا ہے۔ یہ کتاب Centre for Armed Forces Historical Research, United Service Institution of India نے چھاپی ہے۔

یہ سب دیکھنے کے بعد میں نے رنبیر مانگٹ صاحب سے کہا کہ کیا ہم دونوں دونوں جاٹ نسل سے تعلق رکھتے ہیں، میرے آباؤاجداد سکھ تھے جبکہ رنبیر ابھی بھی سکھ ہیں۔ کیا ہم اس بات پر فخر کریں کی ہمارے آباؤاجداد کی پہچان غیر ملکی آقاوں کی حفاظت کرنے والے وفادار اور خوبصورت نوجوانوں کی تھی؟

ان کا جواب خاموشی تھا۔۔۔ لیکن کچھ وقفے کے بعد انھوں نے کہا کہ اب ایسا نہیں ہے۔۔۔اب ہم اپنی پہچان علم کی دنیا میں بھی کروا رہے ہیں۔

میں نے اُن کی بات سے اتفاق کیا اور پھر ہم انڈیا گیٹ کی طرف چل دیے جہاں ہمارے اُن ہندوستانی لوگوں کے نام لکھے ہوئے ہیں جنھوں نے ان غیر ملکی آقاؤں کے لیے جانیں دیں۔

کیا یہ لوگ جنھوں نے ہم پر غیر ملکی تسلط کو قائم کرنے میں اپنی جان تک دی ، ہمارے ہیرو ہیں؟ میرا جواب تو نہ میں ہے۔ وہ ان کے ہیرو ہیں جنھوں نے ان کے نام کے گیٹ بنا کر اِن پر اُن کے نام لکھے ہیں، وہ میرے ہیرو نہیں ہیں۔۔۔



Presidential Body Guard India Photo Credit:
https://www.nationalheraldindia.com

انڈیا گیٹ: انگریز کے وفاداروں کی یاد میں

میں اور رنبیر صاحب صدارتی محل سے مین روڈ پر آ گئے۔ اس سڑک کو راج پاتھ بھی کہتے ہیں اور اسے کنگز وے بھی کہا جاتا ہے۔ ہماری منزل انڈیا گیٹ تھی جو ہمیں دور سے نظر آ رہا تھا۔ انڈیا گیٹ ان ستر ہزار ہندوستانی افراد کی یاد میں بنایا گیا ہے جنھوں نے 1914ء سے 1921ء تک جنگ عظیم اول اور اس کے بعد افغانستان کے

ساتھ انگریزوں کی لڑائیوں میں سلطنت برطانیہ کے پرچم کو بلند رکھنے کے لیے اپنی جانیں قربان کی تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو انڈیا گیٹ کے بارے میں کوئی بات بتاؤں میں یہ چاہوں گا کہ اس گیٹ کا ایک اور پہلو بھی آپ کے سامنے رکھوں۔ ان ستر ہزار افراد کا تعلق ہر طرح کے قبیلے سے تھا۔ ان میں ہندو بھی تھے، سکھ بھی، مسلمان بھی اور علاقے کے اعتبار سے ان میں موجودہ کے پی کے، پنجاب، سندھ، بلوچستان، یو پی، سی پی، گجرات، بنگال، کشمیر، غرض ہر علاقے کے لوگ شامل تھے۔

انگریز کی فوج میں ہندوستانی فوجیوں کی تعداد کتنی ہو گی؟ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ستر ہزار لوگ سات سال میں مارے گئے تو ہندوستان سے تعلق رکھنے والے کتنے لاکھ لوگ ہوں گے جو انگریزوں کی فوج میں شامل تھے؟ یقیناً ان کی تعداد لاکھوں میں ہو گی۔

سلطنت برطانیہ کئی براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے عروج کے زمانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور یہ سچ بھی تھا۔ برٹش انڈیا آرمی اس سلطنت کا ایک حصہ تھی۔ برطانوی سلطنت کو جہاں بھی خطرہ پیش ہوتا تھا تو برٹش انڈیا آرمی کے لوگ وہاں بھیجے جاتے تھے۔ اس آرمی نے جاپان سے افریقہ تک اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ غرض جہاں بھی تاج برطانیہ کو ضرورت ہوتی، برٹش انڈیا آرمی میں ہندوستان سے بھرتی کیے ہوئے فوجیوں کو بھیجا جاتا۔ یہ ہندوستانی سپاہیوں کی وفاداری اور کارکردگی کا ایک اہم ثبوت ہے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے انگریزوں کے ساتھ کسی دوسری قوم کے لوگ نہیں آئے کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ انگریزوں کی ہندوستان کی فتح میں سب سے اہم کردار مقامی لوگوں نے ہی ادا کیا۔

جب اپنے ہی میسر ہوں تو غیر کی کیا ضرورت تھی!

ایک سوال ہمیشہ سے میرے ذہن میں رہا کہ وہ کون سی ایسی وجہ تھی کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہوتے تھے اور ان کے لیے جاپان سے افریقہ تک کے جنگلوں میں جنگ کے لیے جاتے تھے؟ ان میں سے ستر ہزار افراد تو زندہ گھروں کو واپس بھی نہ آئے اور ضرورت کے وقت انھوں نے اپنے ہی ہم وطنوں پر گولیاں بھی چلائیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کے مقدس مقام یعنی خانہ کعبہ پر بھی گولیاں چلانے سے گریز نہیں کیا۔ انگریز کے پاس کونسا ایسا گُر تھا جس کی وجہ سے انھوں نے ان لوگوں کی وفاداری حاصل کی؟ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب میں بہت دیر سے ڈھونڈ رہا تھا۔

ہمارے خاندان کے ایک بزرگ صوبیدار فتح محمد بھی انگریز فوج میں رہے تھے ۔ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ انگریزوں کی فوج میں بھرتی کیوں ہوئے؟ جب کہ انگریزوں کی فوج بہت سی جگہوں پر مسلمانوں کے خلاف ہی جنگ کر رہی تھی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ افغانستان پر حملے کے وقت فوج کی اکثریت مقامی لوگوں پر مشتمل تھی اور جنگ آزادی میں بھی مجاہدین کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں کی فوج میں مقامی لوگ ہی پیش پیش تھے تو وہ کیا وجہ تھی کہ یہ لوگ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف جنگ کرتے تھے؟ میں نے یہ بھی کہا کہ یہاں تک کہ خانہ خدا پر حملے کرنے والے انگریزوں کی فوج میں ہندوستانی مسلمان ہی شامل تھے۔

انھوں نے مجھے جو بات بتائی اس سے میں کسی حد تک تو مطمئن ہوا لیکن مکمل طور پر نہیں ۔انھوں نے یہ کہا کہ ایک تو ہمارے پاس کوئی کام نہیں ہوتا تھا، ہندوستان

میں کوئی انڈسٹری نہیں تھی، پڑھے لکھے ہم نہیں تھے اور کھیتی باڑی کے علاوہ ہمیں کوئی کام نہیں آتا تھا۔ ہماری اکثریت دیہات میں رہتی تھی۔ اتنی پیداوار بھی نہیں ہوتی تھی کہ سُکھ کی زندگی گزار سکیں۔ ہم انگریزوں کی فوج کی نوکری صرف نوکری سمجھ کر کرتے تھے جس کی ہمیں بہت اچھی تنخواہ ملتی تھی۔

مر جانے یا ریٹائرڈ ہونے کی شکل پینشن ملتی تھی اور بہت سی دیگر سہولیات بھی دستیاب تھیں۔ اچھی کارکردگی پر زمین بھی انعام میں مل جاتی تھی۔ فوجی ہونے کے ناطے مقامی انتظامیہ بھی ہمارا خیال رکھتی تھی۔ باقی وہ ہم سے کیا کام لیتے تھے، یہ ان کی مرضی تھی۔ وہ ہمیں گولی چلانے کا حکم دیتے تھے اور ہم چلا دیتے تھے۔ یہ گولی کس کو لگتی تھی اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ ہم تو صرف اور صرف ایک نوکری کی خاطر انگریز کی فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا کوئی شعور بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں۔

میں ان کی بات سے کسی حد تک متفق ہوں۔ میرے خیال میں انگریزوں کا اپنے فوجیوں کے ساتھ حسن سلوک بھی ایک وجہ تھی جس کے نتیجہ میں انھیں وفادار ہندوستانی فوجی ملتے تھے۔ وہ اپنے لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے، ان کی اچھی کارکردگی پر انعام بھی دیتے، ان کے لیے پینشن کا بندوبست بھی کرتے تھے اور مر جانے کے بعد ان کی بیوی بچوں کے لیے بھی پینشن کا نظام قائم رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے کارناموں کی تشہیر بھی کرتے تھے، انڈیا گیٹ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔

اس طرح کی سہولیات کا اس سے پہلے کوئی تصور نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی محکمانہ ترقی بھی ہوتی جس سے معاشرہ میں انکے وقار میں اضافہ ہوتا تھا۔ میں نے بذاتِ خود ڈسکہ میں ایک گھر کے ڈرائنگ روم میں انگریزوں کی طرف سے دیے گئے میڈل سجے دیکھے ہیں۔ میرے سگے ماموں بھی انگریز فوج میں سپاہی تھے۔

تقسیم ہند سے چند ماہ قبل ان کو سکھوں کے ایک جتھے نے شہید کر دیا تھا۔ ان کی پینشن ان کی بیٹی کو شادی تک اور بیوی کو مرنے تک ملتی رہی ہے۔ ان کی بیوی کا انتقال 2010ء میں یعنی انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کے ساٹھ سال بعد ہوا۔

انگریز تو چلا گیا تھا لیکن اس نے اپنے وفادار کے مالی مفادات کا مکمل خیال رکھا۔ روپو چک ظفروال ضلع نارووال کے رہنے والے میرے انتہائی پیارے دوست جناب فیصل ٹھاکر صاحب نے مجھے اپنے گاؤں میں لگی ایک تختی کی تصویر بھیجی ہے۔ یہ تختی انگریزوں نے تقسیم ہند سے قبل لگائی تھی۔ اس پر لکھا ہوا ہے کہ اس گاؤں کے ستانوے لوگوں نے جنگ عظیم اوّل میں تاج برطانیہ کی سربلندی کے لیے فوج میں خدمات سر انجام دیں اور جن میں سے دو واپس اپنے گھروں کو نہ آسکے اور وہ تاج برطانیہ کی آن بچاتے ہوئے قربان ہو گئے۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے مری کے ایک علاقے میں ایک گاؤں کی دیوار کے اوپر ایک سلیٹ لگی ہوئی دیکھی تھی جس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ اس گاؤں کے اکیس لوگوں نے سلطنت برطانیہ کی خاطر اپنی جانیں دی تھیں۔ دوسری جنگِ عظیم میں اعلیٰ کارکردگی دکھانے والے کسی نان کمیشنڈ آفیسر کی یہ خواہش تھی کہ میرے گاؤں کے باہر توپ لگائی جائے۔ اس کی یہ خواہش پوری کی گئی اور اب کلر کہار سے چواسیدن شاہ جاتے ہوئے راستے میں یہ گاؤں آتا ہے۔ جہاں یہ توپ نصب ہے۔ یہ بھی اپنے وفادار لوگوں کے خیال رکھنے کا ایک انداز ہے۔

ایک طرف نوکری، سہولیات، میڈل تھے اور دوسری طرف اپنے ہی ہم وطن تھے جن پر گولی چلانے کا حکم ملتا تھا۔ سب نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق فیصلہ کیا۔ اس میں ان پڑھ لوگ بھی تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے۔ تقسیم ہند کے بعد انگریز کی فوج اور انتظامیہ کے لوگ ہی ہمارے حکمران

ٹھہرے۔ پاکستان کا پہلا فوجی حکمران بھی انگریز کی فوج میں ایک آفیسر تھا۔ وہ ہمارے ملک کا حکمران تو بن گیا لیکن وہ اپنے سابقہ حاکموں کو کیسے بھول سکتا تھا؟ وہ ایک جگہ حاکم تھا اور دوسری طرف محکوم تھا۔ ایسے لوگوں نے حقِ وفاداری خوب نبھایا۔ تاریخ اس کی ہمیشہ گواہی دے گی۔

انڈیا گیٹ کا پرانا نام آل انڈیا وار میموریل تھا جس کی بنیاد 1921ء میں رکھی گئی اور 1931ء میں اسے مکمل کیا گیا۔ اس گیٹ کے اوپر 13,300 لوگوں کے نام کندہ ہیں۔ یہ گیٹ انگریزوں کی اپنے لوگوں کی قدر دانی کا مظہر ہے جس کے بدلے مقامی لوگ اپنی وفاداریاں پیش کرتے تھے۔ یہ بھی انعام کی ایک شکل ہے جو انگریز ان لوگوں کو دیتے تھے، جو ان کے لیے جان تک قربان کر دیتے تھے۔

اگر میں اپنے بزرگ کی اور اس بات کو ملا لوں کہ وہ اپنے لوگوں کا بے حد خیال رکھتے، تو کسی حد تک مجھے میرے سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ کیوں اہلِ ہند اپنے ملک سے ہزاروں میل دور افریقہ کے جنگلوں میں جا کر لڑتے تھے اور اپنی جان بھی قربان کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

میں انھی خیالات میں گم انڈیا گیٹ کے پاس پہنچ گیا۔ میرے سامنے انڈیا گیٹ ایک گیٹ نہیں تھا بلکہ وہ ایک تاریخ کی کتاب کے مانند تھا جو مجھے بتا رہا تھا کہ مجھے پڑھو تا کہ تم جان سکو کہ کروڑوں انسانوں پر مشتمل آزاد قوم غلام کیسے بنتی ہے؟ ایک وسیع و عریض علاقہ جس کا رقبہ بتالیس لاکھ مربع کلومیٹر سے بھی زائد تھا اس پر ایک ایسے ملک کے لوگ قابض تھے جنکے اپنے ملک کا رقبہ صرف اڑھائی لاکھ مربع کلومیٹر تھا، یعنی ہم سے اٹھارہ گنا کم۔ یاد رہے ایک گیٹ وے ٹو انڈیا ہے جو کہ ممبئی میں ہے۔ وہ گیٹ جارج پنجم کے دورہ کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ اس کا احوال میں بعد میں بیان کروں گا۔

انڈیا گیٹ تقریباً ایک سو چالیس فٹ کے قریب بلند ہے۔ کسی وقت میں اس کے نیچے سے گاڑیاں گزرتی تھیں مگر اب ایسا نہیں ہے۔ میں بہت دیر تک گیٹ کے اوپر کندہ کیے ہوئے نام پڑھتا رہا۔ ان ناموں میں مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں سمیت سبھی کے نام تھے بلکہ ایک جگہ تو خواتین کے نام بھی تھے جس سے لگتا تھا کہ انگریز کی وفاداری میں خواتین بھی مردوں سے پیچھے نہیں رہیں۔ میں اپنے ماموں دین محمد کا نام ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن نہ مل سکا۔ شاید جگہ کم تھی اور وفادار زیادہ تھے۔۔۔

مجھے یاد ہے کہ میرے نانا جان، اپنے جوان بیٹے کی یاد میں اکثر آنسو بہاتے تھے اور ان کی بیوہ بھی اپنے سہاگ کو یاد کرتی تھیں اور ان کی بیٹی کو تو اپنے باپ کی شکل بھی یاد نہیں تھی لیکن باپ کا ذکر تو ہر بیٹی شوق سے ہی کرتی ہے، چاہے دیکھا ہو یا نا ہو۔

اے انگریز صاحب بہادر!

یاد رہے کہ گیٹ پر نام لکھنے سے اُن تمام دکھوں کا مداوا نہیں ہوتا جو آپ کی وجہ سے ہم نے سہے ہیں۔۔۔

انڈیا گیٹ کے نیچے نشانی کے طور پر ایک آلاؤ جل رہا ہے۔ یہ 1972ء میں مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بناتے ہوئے ہلاک ہونے والے بھارتی سپاہیوں کی یاد میں جلایا گیا تھا۔ اسے وہ گمنام سپاہیوں کی یاد میں شمع جلانا کہتے ہیں۔ بظاہر ایک کالے پتھر سے بنے ڈبے کی شکل میں بنائی گئی ایک یادگار جس پر فوجی لباس پہنے لوگوں کی شکلیں بنی ہوئی تھیں، کا انڈیا گیٹ سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ اس یادگار سے انڈیا گیٹ کی خوبصورتی میں کمی واقع ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بھارت کی حکومت کو اپنے سپاہیوں کی قربانی کی یاد میں کچھ بھی بنانے کا حق ہے لیکن کسی بنی بنائی چیز کو بگاڑنے سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر ہے۔

جنھوں نے بنگلہ دیش بنانے میں جان قربان کی ان کے لیے شمع جلانا بھارت کا حق ہے۔۔۔ جنھوں نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بننے سے روکنے کی کوشش کی ان کے لیے کوئی شمع نہیں جلائی گی۔۔۔ میں نے پورا پاکستان ڈھونڈ مارا، کوئی ایسی شمع نہ ڈھونڈ پایا۔

اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم انھیں اپنا ہیرو ہی نہیں مانتے!

اگر آپ انڈیا گیٹ کو ایک عمارت سمجھیں تو یہ ایک لاجواب عمارت ہے۔ دنیا میں اس طرح کے بے شمار گیٹ موجود ہیں جو کسی نہ کسی کی یاد میں بنائے گئے ہیں۔ انگریزوں نے یہ گیٹ بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے وفادار سپاہیوں کو نہیں بھولتے اور انکی قدر کرتے ہیں۔

جو کسی ایک کا وفادار ہوتا ہے اور دوسرے کا دشمن تو لازم ہوتا ہے!

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مین گیٹ سے ہٹ کر مناسب فاصلے پر ایک کنوپی بنائی گئی تھی اور اس کے نیچے برطانیہ کے بادشاہ جارج پنجم کا مجسمہ رکھا گیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد کچھ لوگوں نے اسے ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ اپنے مطالبے کے حق میں انھوں نے کافی ہنگامہ کیا اور اس دوران مجسمے کو نقصان بھی پہنچایا گیا۔ ہنگامہ کرنے والوں نے وہاں سبھاش چندر بھوش کا مجسمہ رکھ دیا۔ بھارتی حکومت نے بادشاہ کا مجسمہ وہاں سے ہٹا دیا۔ اب یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اسے کہاں رکھا جائے۔ ایک رائے یہ تھی کہ اسے برطانیہ بھجوادیا جائے، جس پر عمل نا ہوسکا۔ دوسرا یہ حل تجویز ہوا کہ دہلی میں واقع برطانیہ کی ایمبسی میں رکھا جائے لیکن وہاں اتنی جگہ نہ تھی۔ بالآخر اسے آخری چارہ کار کے طور پر ایک ایسی جگہ پر رکھا گیا جہاں اور بہت سارے مجسمے رکھے ہوئے تھے، یہ ایک وسیع پارک ہے جہاں اور بھی بے شمار مجسمے پڑے ہیں۔

اسے کہتے ہیں زمانے کی ناقدری۔ جب بادشاہ تھا تب اس کے لیے سب کچھ تھا، جب وہ بادشاہ نہ رہا تو اس کے مجسمے کے لیے جگہ بھی باقی نہ رہی۔

میں اور رنبیر صاحب کافی دیر تک وہاں پر رہے۔ ہم نے مختلف ناموں کو پڑھنے ہی میں اپنا زیادہ وقت صرف کیا۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ تو نہیں تھا۔ اس وقت دہلی میں یہ سب سے آسان پکنک پوائنٹ ہے جہاں آپ گزرتے ہوئے بھی رک سکتے ہیں۔ انڈیا گیٹ کے بارے میں David A. Johnson and Nicole F. Gilbertson نے اپنی کتاب Commemorations of Imperial Sacrifice at Home and Abroad: British Memorials of the Great War میں کافی تفصیل دی ہے۔ اس کتاب میں انڈیا گیٹ کے علاوہ بھی کئی اور یادگاری عمارتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے بھی اس کتاب کے کچھ حصوں کا مطالعہ کیا ہے۔ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے[14]۔



India Gate, Photo Credit:https://theculturetrip.com

[14] http://www.societyforhistoryeducation.org/pdfs/Johnson_and_Gilbertson.pdf

انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی دہلی : ایک مایہ ناز تعلیمی ادارہ

انڈیا جانے سے پہلے مجھے جن مقامات پر جانے کا شوق تھا ان میں ایک انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی دہلی بھی تھا، جسے عرف عام میں آئی آئی ٹی دہلی کہتے ہیں۔ جانے سے پہلے میں نے ڈاکٹر کھتری صاحب جو کہ ٹیکسٹائل کے شعبہ کے سر براہ تھے سے رابطہ کیا اور ان کے ہاں آنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میرا تعلق بھی ٹیکسٹائل سے ہونے کی وجہ سے انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہوگی کہ پاکستان سے ٹیکسٹائل سے تعلق رکھنے والے کوئی پروفیسر ہمارے پاس آئے۔

آج میں نے جن جگہوں پر جانا تھا ان میں ایک آئی آئی ٹی دہلی کا ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ بھی تھا۔ میں صبح دس بجے کے قریب آئی آئی ٹی دہلی پہنچ گیا۔ پہلی ہی نظر میں، جو میں نے دیکھا اس سے میرے ذہن میں موجود ادارے کے تصور کو تھوڑا سا دھچکا لگا۔ میرا خیال تھا کہ جتنا بڑا نام ہے اسی طرح کی عالی شان عمارت بھی ہوگی۔ بہت بڑے بڑے لان ہونگے۔ رنگ برنگی عمارات ہوں گی۔ جیسا کہ ہم یہاں دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہماری پنجاب یونیورسٹی ہے۔ جب میں اس کے مین گیٹ سے اندر آیا تو اہم بات جو اس ادارے میں مجھے نظر آئی وہ یہاں کی سادگی تھی۔ جس سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے لگا کہ شاید اس ادارے کی صرف شہرت زیادہ ہے لیکن علم کے میدان میں اس کی کارکردگی بھی شاید سادہ سی ہی ہوگی۔

ان ہی خیالات کے ساتھ میں ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ چلا گیا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب نے خوش آمدید کہا۔ یہ ٹیکسٹائل سے متعلقہ پاکستان کے کسی بھی پروفیسر کا ان کے ادارے کا پہلا دورہ تھا۔ میں ان سے ٹیکسٹائل کی تعلیم اور ریسرچ کے بارے باتیں کرتا رہا۔ اس ادارے میں ایک اور صاحب بھی کام کرتے ہیں جن کا نام ڈاکٹر سید اشتیاق ہے۔ اس دن وہ وہاں موجود نہیں تھے اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس سے پہلے کہ میں

آپ کو ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں بتاؤں، میں علمی دنیا کی ایک خوبصورت اور سچی کہانی آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔

ایک صاحب جن کا نام این ایم سرکار تھا، وہ وائسرائے کی قائم کردہ ایجوکیشن کمیٹی کے ممبر تھے . یہ تقسیمِ ہند سے پہلے کی بات ہے۔انھوں نے 1945 ء میں حکومت ہند کو یہ تجویز پیش کی کہ ایک ٹیکنکل انسٹیٹیوٹ بنایا جائے۔اس دوران تقسیم ہند کا واقعہ رونما ہوگیا اور یوں اس تجویز پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔چند سال کی تاخیر سے 1950ء میں مغربی بنگال کے ایک صنعتی شہر کھڑگپور میں پہلا انڈین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی بنایا گیا۔اس ادارے نے اپنے علاقے کے لوگوں کی بے حد خدمت کی۔اس کی کامیابی دیکھ کر حکومت ہند نے اسطرح کے مزید ادارے بنانے کا فیصلہ کیا۔اس وقت کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے اس مقصد کے لیے مغربی ممالک اور روس سے مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان ممالک نے ایسے ادارے بنانے کے لیے دل کھول کر تعاون کیا۔روس کی مدد سے سب سے پہلا ادارہ آئی آئی ٹی بمبئی بنایا گیا۔اس کے بعد مغربی جرمنی، امریکہ اور برطانیہ کی مدد سے مدراس، کانپور اور اور دہلی میں ایسے ادارے بنائے گئے۔

ابتداء میں ان کی تعداد چھ تھی لیکن 2004ء کے بعد دس مزید ایسے ادارے بنائے گئے۔اس طرح بھارت میں اب انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے نام سے سولہ ادارے موجود ہیں۔ آئی آئی ٹی دہلی کے لیے تمام تر معاونت برطانیہ نے فراہم کی اور 1959ء میں پرنس فلپ نے اس کا سنگ بنیاد رکھا اور صرف دو سال بعد 1961ء میں پہلا داخلہ ہوا۔

علمی دنیا میں ان اداروں کی اب کیا پوزیشن ہے؟ یہ جاننے کے لیے کوالٹی سٹینڈرڈز کے مطابق دنیا کی ٹاپ یونیورسٹیز کی فہرست جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے کو دیکھتے ہیں۔اس فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ آئی آئی ٹی بمبئی 152 نمبر پر اور آئی آئی ٹی دہلی 182 نمبر پر، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس 184 نمبر پر، آئی آئی ٹی مدراس 271

نمبر پر، آئی آئی ٹی کھڑگپورہ 281 نمبر پر اور آئی آئی ٹی کانپور 291 نمبر پر ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بھارت کی ان چھ آئی آئی ٹیز میں سے پانچ کا شمار دنیا کی پہلی تین سو یونیورسیٹیز میں ہوتا ہے۔ جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بھارت کے اندر اور بھارت سے باہر بھی ان اداروں نے علم کی دنیا میں کتنا بڑا نام کمایا ہے۔ اس لسٹ میں پاکستان کی ایک یونیورسٹی، نسٹ کا نمبر 400 ہے۔ اس میں ہمارے لیے بھی ایک سبق ہے جو ہمیں سیکھنا ہوگا کیونکہ ہم میں بھی دنیا میں باعزت طریقے سے زندہ رہنے کی خواہش تو موجود ہے۔ آئی آئی ٹی کے بارے میں مزید معلومات ان کی ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

اس یونیورسٹی کا ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ بھی علم کی دنیا میں ایک نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ کھتری صاحب نے بتایا کہ ان کے شعبہ میں سولہ پی ایچ ڈی ڈاکٹرز کام کر رہے۔ یہ 1996 ء کی بات ہے جب پاکستان کی پہلی ٹیکسٹائل یونیورسٹی بنی تھی۔ یہ بھی کوئی نئی یونیورسٹی نہیں تھی بلکہ ٹیکسٹائل کالج فیصل آباد جس کا سنگ بنیاد 1959ء میں صدر ایوب خان نے رکھا تھا کو ہی اپ گریڈ کیا گیا تھا۔ میری تعلیم بھی اسی کالج سے ہے۔ اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملنے سے پہلے یہاں سے تعلیم حاصل کرنے والے طالبعلموں کو ڈگری انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور جاری کرتی تھی۔

جب کھتری صاحب نے مجھے اپنی لیبز دکھائیں تو مجھے عمارت کی سادگی بھول گئی اور مجھ پر ان کے علم کی گہرائی کا بہت گہرا اثر ہوا۔ میں نے ان کے طالبعلموں کے ساتھ بھی کچھ وقت گزارا۔ اس وقت میں بھی لاہور میں واقع یو ایم ٹی میں پڑھاتا تھا، اس لیے ہمارے درمیان باہمی دلچسپی کے کئی موضوعات تھے۔ میں نے ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ میں ہونے والی ریسرچ کا جائزہ لیا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہمارے اور ان کے تعلیمی کام کے درمیان میں بہت واضح فرق ہے، جسے پاٹنے کی اشد ضرورت ہے۔

اس وقت آئی آئی ٹی دہلی کو ایک مکمل آزاد اور خود مختار ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ ادارہ 30 فیصد تک غیر ملکی طلبہ کو اپنے ہاں داخلہ دے سکتا ہے۔ میں وہاں ایک مناسب

وقت گزارنے کے بعد اس عزم کے ساتھ واپس ہوا کہ اللہ کرے ہم بھی پاکستان میں ایسا کوئی ادارہ بنا سکیں۔ اس کے بعد میں جب بھی بھارت گیا تو اِس ادارے میں ضرور گیا اور میری مختلف لوگوں سے ملاقات بھی رہی۔ ڈاکٹر اشتیاق صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، وہ ٹیکسٹائل ریسرچ کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام ہیں۔

جب میں یونیورسٹی سے باہر نکلا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اگر ظاہری شان و شوکت پر زور دیا جائے تو بعض اوقات اصل مقصد سے توجہ ہٹ جاتی ہے!

History

HRH Prince Philip, the Duke of Edinburgh, laid the foundation stone of the Institute on January 27, 1959. The Institute was inaugurated by Prof. Humayun Kabir, Union Minister for Scientific Research and Cultural Affairs on August 21, 1961. The Institute buildings were formally opened by Dr. Zakir Hussain, President of India, on March 2, 1968.



IIT Dehli Stone Foundation Ceremoney by Prince Philips, Photo Credit: https://iitdalumni.com

قطب مینار اور مسجد قوت الاسلام

قطب مینار آٹھ سو سال پرانا تاریخی مینار ہے جو نیو دہلی کے مغرب میں علاقہ مہرولی میں بنایا گیا تھا۔ مہرولی میں قطب مینار کے ساتھ مسجد قوت الاسلام بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ وہاں پر اور بھی کئی پرانی عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی وقت یہاں پر ایک راجہ کا قلعہ بھی تھا جس کا نام لال کوٹ تھا۔

آج میں نے قطب مینار اور اس کے قرب و جوار میں واقع مختلف تاریخی مقامات کو دیکھنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ میں جب اس علاقے میں گیا تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ ایک بہت وسیع علاقہ ہے اور دہلی شہر کی نسبت اونچائی پر بھی واقع ہے۔ میں نے اس علاقے میں چند مقامات پر پتھر کی کٹائی وغیرہ کا کام بھی ہوتے دیکھا تھا (جو بعد میں پتہ چلا کہ بند کر دیا گیا ہے)۔ اس سے مجھے تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی موجود ہیں۔ مجھے مہرولی کو دیکھ کر یوں لگا کہ اونچائی پر ہونے کی وجہ سے دفاعی نقطۂ نظر سے یہ ایک محفوظ مقام تھا۔ اسی لیے یہاں پرانے وقتوں میں حکمرانوں نے قلعہ بنایا تھا۔ میں جب قطب مینار پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں پر بے شمار لوگ موجود تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ایک بہت ہی مشہور پکنک پوائنٹ ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو اس جگہ کے متعلق بتاؤں، میں چاہوں گا کہ اس کی مختصر تاریخ آپ کے سامنے رکھی جائے۔

تاریخ سے پتا لگتا ہے کہ جن سات شہروں کو ملا کر دلی شہر آباد کیا گیا، ان میں مہرولی بھی شامل تھا۔ قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں مسلمان سلطنت کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ جب میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ قطب الدین ایبک نے یہ کام کیسے کیا تو مجھے بڑی ہی دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ بہت ہی آسان الفاظ میں انھیں آپ کے سامنے پیش کروں۔

محمود غزنوی 971ء میں موجودہ افغانستان کے ایک شہر غزنی میں پیدا ہوا اور اپنے علاقے میں غزنوی سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کا مزار بھی غزنی میں ہی ہے۔ اس نے 1001 میں تیس سال کی عمر میں شمالی اور وسطی ہندوستان پر اپنا پہلا حملہ کیا۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر کل سترہ حملے کیے لیکن اس نے یہاں اپنی کوئی حکومت قائم نہیں کی۔ یہ بات جزوی طور پر درست ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس نے لاہور میں اپنے گورنر مقرر کر رکھے تھے۔ جو اس کی غیر حاضری میں اس کے فتح کیے ہوئے علاقوں کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن اس کا یہ انتظام پشاور سے لیکر لاہور تک ہی تھا۔

محمود غزنوی حملہ کرتا اور بہت سا مالِ غنیمت سمیٹ کر واپس چلا جاتا۔ اس کا سومنات کے مندر پر حملہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ محمود غزنی کے حملوں کے 190 سال بعد محمد غوری نے دلی پر حملہ کیا۔ محمد غوری کا تعلق موجودہ افغانستان کے مرکزی حصے غور سے تھا جو کابل کے جنوب میں اور قندھار کے مغرب میں واقع ہے۔ اس نے یہاں پر کئی جنگیں لڑیں اور بہت سے مقامی ہندو حکمرانوں کو شکست دی۔ غوری کے متعلق ابھی تک یہ طے نہیں ہے کہ وہ پختون تھا یا ترک لیکن ایک بات طے ہے کہ اس کی مادری زبان فارسی تھی۔

اس نے اکثر حملے درہ گومل کے راستے کیے اور ملتان سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ اس لیے ملتان کو ہندوستان کا دروازہ بھی کہتے تھے۔ اس نے 1191 ء میں خیبر پاس کے ذریعے ہندوستان پر ایک بڑا حملہ کیا اور ہریانہ کے علاقے تھانیسر کے پاس پرتھوی راج چوہان کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں تقریباً تین لاکھ کی تعداد میں راجپوت شریک تھے اور غوری کے ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار کی فوج تھی۔ ایک گھمسان کی جنگ کے بعد غوری یہ جنگ جیت گیا۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان میں اپنی سلطنت کا باقائدہ اعلان کر دیا اور افغانستان واپس نہ جانے کا فیصلہ کیا اور دلی کو اپنے ایک ترک سردار، قطب الدین ایبک کے حوالے کرکے موجودہ پاکستان کے علاقے میں آ گیا۔

1206ء میں جہلم کے علاقے میں اس کی وفات ہوئی اور جہلم کے پاس ہی سوہاوہ کے مقام پر اس کا مزار بنایا گیا جو اب بھی قائم ہے۔

اس کی وفات کے بعد اس کے گورنر قطب الدین ایبک نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا اور سلاطین دلی کے نام سے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ یوں ہندوستان میں باقاعدہ ایک مسلمان ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ سلاطین دلی کا راج کسی نا کسی صورت میں 1206ء سے 1526ء تک شمالی اور وسطی ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں قائم رہا۔ تقریباً تین سو بیس سال سلاطین دلی کے نام سے یہ حکومت چلتی رہی ۔ پھر بابر نے ابراہیم لودھی کو جو کہ افغان تھا شکست دے کر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

قطب الدین ایبک نے اس علاقے کو فتح کرنے کی خوشی میں 1198ء میں مسجد قوت الاسلام کی تعمیر شروع کی۔ یہ مسجد ہندوستان کی سب سے پرانی مسجد تو شاید نہ ہو لیکن قدیم مساجد میں اس کا شمار ضرور ہوتا ہے۔ مسجد کے ساتھ قطب الدین ایبک نے ایک بلند مینار تعمیر کروانے کا بھی فیصلہ کیا جس کا نام قطب مینار رکھا گیا۔ یہ نام رکھنے کی وجہ ایک نہایت قابل احترام صوفی خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ہیں۔ اتفاق سے بادشاہ کا نام بھی قطب تھا۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ قطب الدین ایبک لاہور میں پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر فوت ہو گیا تھا۔ اگر آپ لاہور میں واقع لوہاری گیٹ کی طرف سے نئ انار کلی میں داخل ہوں تو آپ اپنے بائیں طرف قطب الدین ایبک کا مزار دیکھ سکتے ہیں۔ قطب الدین کی اچانک موت کی وجہ سے قطب مینار کی صرف تین منزلیں ہی بن سکیں۔ بعد میں اسے شمس الدین التمش نے مکمل کیا، کچھ کام بعد میں آنے والے بادشاہوں نے بھی کیے۔ شیر شاہ سوری بھی تعمیرات کا شوقین تھا،اس نے بھی قطب مینار کی تعمیر میں اپنا حصہ ڈالا۔

قطب مینار کی بلندی 240 فٹ ہے اور اس کی بنیاد کی چوڑائی پچاس فٹ کے قریب ہے جو اوپر جا کر نو فٹ رہ جاتی ہے۔ مینار کے اندر گول سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں جن کی تعداد 380 ہے۔ پہلے لوگوں کو اوپر جانے کی اجازت تھی لیکن 1981ء میں بھگڈر کی وجہ سے بہت سے لوگ ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد سے اب اوپر جانا منع ہے۔ آپ صرف باہر سے ہی مینار کو دیکھ سکتے ہیں۔

میں کافی دیر تک اس مینار کے سامنے ایک جگہ بیٹھ کر اس کی کاریگری کو دیکھتا رہا۔ آپ خود اندازہ کریں کہ اس وقت آمدورفت کے ذرائع بھی بہت کم تھے اور سائنس نے بھی اتنی ترقی نہیں کی تھی لیکن اتنے بلند مینار کی سیدھ میں صرف بیس انچ کا ٹیڑھا پن ہے، جو خطرناک نہیں سمجھا جاتا، یہ کیسے ممکن ہوا؟ اس کام کے لیے جتنی مہارت اور علم کی ضرورت تھی اس کا صحیح اندازہ ماہرین تعمیرات ہی کر سکتے ہیں۔ اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آج سے ایک ہزار سال قبل بھی ہندوستان کے لوگوں کے پاس اتنا علم ضرور تھا جسے استعمال کرکے انھوں نے اتنی شاندار عمارتیں تعمیر کیں۔

مغلوں کی تعمیر میں نا صرف بہت وسعت ہوتی ہے بلکہ پیسے کا استعمال بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جبکہ اس مینار میں کاری گری کی انتہا ہے۔ یہ معمولی مینار نہیں ہے بلکہ اسے غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا اس کے چاروں طرف بہت خوبصورت کام کیا گیا ہے۔ قرآنی آیات بھی لکھی ہوئی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے بہت ہی ذہین اور تربیت یافتہ کاریگروں نے بنایا ہے۔

ہندوؤں کا یہ کہنا ہے کہ اس جگہ پر ان کے ایک بھگوان وشنو کی چوتھی صدی کی نشانی بھی موجود ہے۔ مختلف اوقات میں مینار کو آسمانی بجلی اور زلزلوں سے نقصان پہنچا لیکن اس کی مرمت بھی ہوتی رہی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مینار کی بالکل ٹاپ پر ایک کنوپی بنی ہوئی تھی جسے انگریز دور میں حفاظت کے نقطۂ نظر سے اٹھا کر نیچے رکھ دیا گیا اور اب وہ مینار کے پاس نیچے پڑی ہوئی ہے۔

مجھے اس مینار کو دیکھ کر احساس ہوا کہ یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ اُس وقت مسلمان سائنس نہیں جانتے تھے۔ ایک ہزار سال پہلے دو سو چالیس فٹ بلند مینار کی تعمیر، جو آج بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہے ، اس کے اوپر بے شمار نقش و نگار، اس کے لیے کتنی مضبوط بنیاد چاہیے تھی، کس طریقے سے سامان اوپر لے کر جانا تھا اور اس میں کیسا رنگ و روغن استعمال کرنا چاہیے تھا جو اب تک بھی موجود ہے، پتھر جوڑنے کے لیے کیا مٹیریل استعمال کیا گیا، میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ تعمیر کی انجینئرنگ سمجھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یقیناًاِسے بنانے والے یہ سب معلومات بہت اچھے طریقے سے رکھتے تھے۔ تب ہی انھوں نے ایک ایسا مینار بنایا جو آٹھ سو سال سے زلزلے بھی برداشت کر رہا ہے اور گرمی سردی میں بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

عمومی طور پر ایک بات کہی جاتی ہے کہ کتنا اچھا ہوتا اگر اس مینار کی جگہ پر ایک بڑی درسگاہ ہوتی۔ میں تو یوں کہوں گا کہ مینار کے ساتھ درسگاہ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ مینار کی اہمیت اپنی جگہ اور یونیورسٹی کی ضرورت اپنی جگہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

میں آج تک جن عمارتوں کی کاریگری سے متاثر ہوا، ان میں یہ عمارت بھی شامل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ آپ تصاویر سے اس عمارت کی شان و شوکت کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔ یہ مینار دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے کیونکہ کہ اس کی اونچائی بہت زیادہ اور چوڑائی کم ہے۔ اسی وجہ سے تصاویر سے اس کا اصل حسن ظاہر نہیں ہوتا۔

قطب مینار کے متعلق ایک بہت ہی مفید مضمون مرینالینی راجاگوپلان ایک مضمون A Medieval Monument and Its Modern Myths of Iconoclasm: The Enduring Contestations over the Qutb

Complex in Delhi, India کے نام سے ایک کتاب میں لکھا ہے[15]۔ یہ ایک انتہائی مفید کتاب ہے۔ میں نے اس کتاب میں بھی پڑھا ہے کہ چند ہندوؤں نے مسجد قوت الاسلام میں ہندو طریقہ سے عبادت کرنے کا اعلان بھی کیا۔ جس کی عام لوگوں نے سخت مخالفت کی۔



At Qutub Minar Dehli

Rajagopalan, Mrinalini (2012). "A Medieval Monument and Its Modern Myths of Iconoclasm: The Enduring Contestations over the Qutb Complex in Delhi, India". In Kinney, Dale; Brilliant, Richard (eds.). *Reuse Value: Spolia and Appropriation in Art and Architecture from Constantine to Sherrie Levine*. Ashgate Publishing. pp. 199–221. doi:10.4324/9781315606187. ISBN 978-1-4094-8684-8.[15]

مسجد قوت الاسلام: برِ صغیر کی ایک قدیم مسجد

یہ مسجد بہت بڑے صحن کے ساتھ ایک عمارت پر مشتمل ہے۔ اس کی تعمیر مینار سے بھی پہلے 1198ء میں شروع ہوئی تھی۔ ایک عجیب بات میرے لیے باعثِ حیرت تھی اور آپ بھی اسے آسانی سے قبول نہ کر سکیں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب میں مسجد کی سیر کر رہا تھا تو میرے گائیڈ نے بتایا کہ ستائیس مختلف مندروں کو توڑ کر اس مسجد کے ستون بنائے گئے تھے۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے لگا شاید یہ ایک ہندو ہے اور میں مسلمان ہوں اسی لیے وہ جان بوجھ کر ایسی بات کر رہا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ مندروں کا سامان مساجد میں استعمال ہوا ہو؟ قطب الدین ایبک تو خود ایک بہت ہی مذہبی آدمی تھا اور اس کی خواجہ بختیار کاکی سے بھی بہت زیادہ عقیدت تھی۔ گائیڈ نے میری بات سن کر کہا کہ میں آپ کو کچھ چیزیں دکھاتا ہوں۔ اس نے مسجد کے چاروں طرف برآمدے میں لگے ہوئے بے شمار ستون دکھائے جن پر مختلف بتوں کی تصویریں تھیں جو عام طور پر مندروں میں ہوا کرتی ہیں۔ ان میں سے متعدد تصاویر کو کھرچ کر ختم کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن کچھ تصاویر تاحال موجود تھیں۔

آج یہ سفر نامہ لکھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ اسی طرح کا واقعہ میرے ساتھ مسجد قرطبہ میں بھی پیش آیا تھا۔ جب میں مسجد قرطبہ اسپین کے اندر جانے لگا تو گیٹ پر موجود سپاہی نے کہا کہ اب یہ کیتھڈریل ہے، مسجد نہیں اور آپ اس میں نماز نہیں پڑھ سکتے۔ جب میں مسجد قرطبہ کے اندر گیا تو دیکھا کہ وہاں کی ساری ترتیب ایک چرچ کی سی تھی یعنی کرسیاں وغیرہ لگی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں ایک مختصر سی جگہ بند کی ہوئی تھی جہاں

مسجد کے آثار نظر آ رہے تھے، یعنی محراب بنی ہوئی تھی لیکن نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

سپین کے عیسائیوں کا بھی یہی کہنا تھا کہ اس وقت کے مسلمانوں نے گرجے کی جگہ کو زبردستی خرید کر مسجد میں تبدیل کیا ہوا تھا۔ قرطبہ کی انتظامیہ کے حکم کے مطابق زمین پر سجدہ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔۔۔ لیکن ہوا میں سجدہ کرنے سے کون روک سکتا تھا۔۔۔ سو میں نے کھڑے کھڑے نماز عصر ادا کی۔۔۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔۔۔

میں نے گائیڈ سے مزید جاننا چاہا تو اس نے بتایا کہ اس مسجد کے برآمدے میں جتنے بھی ستون ہیں سب ہندوؤں اور جین مندروں سے لائے گئے ہیں۔ میرے لیے ان سب پر یقین کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا پھر میں انکار کیسے کرتا؟ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ہندوؤں اور جین مت کے ماننے والوں کے بے حد اصرار پر اب یہاں کوئی مسلمان نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اب یہ مسجد صرف ایک تفریح گاہ ہے۔ جب تک مسلمانوں کی حکومت تھی تو یہ مسجد آباد تھی لیکن جب اُن کی حکومت آئی جن کے مندر توڑے گئے تھے تو مسجد کو بند کر دیا گیا۔ اب اس کا نام مسجد قوت الاسلام ہے لیکن در حقیقت یہ ایک تفریح گاہ ہے۔

یہ سب دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ جہاں پر ایک مسلمان بادشاہ اتنا بڑا مینار بنا سکتا تھا کہ جس کی دنیا میں اُس وقت کوئی مثال نہیں ملتی تھی اس کے لیے کیا ممکن نہیں تھا کہ وہ مسجد کے لیے بھی نئے ستون بنواتا اور کسی مندر کی کوئی چیز اٹھا کر یہاں نا رکھتا؟ اگر قطب الدین ایبک نے ایسا کیا ہوتا تو آج میں اس مسجد میں نماز ادا کر سکتا تھا۔ میرے خیال میں دنیا میں یہ دو مساجد ہیں جو بنی تو مساجد تھیں لیکن ان میں نماز نہیں ہوتی۔

آہ ۔۔۔کاش ایسا نہ ہوتا اور ہم اس میں نماز پڑھتے اورآج کسی کو اسے بند کرنے کی ہمت نہ ہوتی !



Mosque Quwat ul Islam with Waqas sb and Umer Sb
(during second trip of India)

لوہے کاایک ستون: جو کتناپرانا ہے کوئی نہیں جانتا

مسجد کے صحن میں ایک لوہے کا بہت بڑا ستون تھا ہے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں یہ ستون کہاں بنااور کب یہاں لایا گیا تھا۔ اس کے اوپر نا قابلِ شناس تحریریں لکھی ہوئی تھیں۔اس کی اونچائی چوبیس فٹ کے قریب ہےاوراس کے وزن کا بھی کسی کو صحیح اندازہ نہیں ہے۔ سائنس کی دنیامیں یہ ایک بہت ہی عجیب و غریب بات ہے کہ اس ستون کو کسی بھی طرح کازنگ نہیں لگتا۔ بہت سے لوگوں نے اس پر تحقیق کی ہےاور وہ اس بات پر قائل ہوئے کہ جب ہزاروں سال پہلے اسے بنایا گیا تھاتواس وقت کے لوگ سائنس کو بہت اچھے طریقے سے سمجھتے تھے ۔اسے بناتے ہوئے کس طرح کے کیمیکل استعمال کیے

گئے، ان کا کسی کو اب تک کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ میں نے دیکھا کہ اس پر کوئی رنگ نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے اوریجنل کلر میں تھا۔

قطب مینار سے ذرا فاصلے پر ایک نا مکمل مینار ہے اسے علاؤالدین کا مینار کہتے ہیں ۔تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی نے یہ سوچا کہ وہ بھی ایک مینار بنائے گا جو قطب مینار سے دوگنا بلند ہوگا۔اس پر کام بھی شروع کیا گیا لیکن ابھی اس کی پہلی منزل ہی بنی تھی کہ سلطان علاؤالدین خلجی فوت ہو گیا اور وہ مینار نا مکمل ہی رہا۔ میں اس نا مکمل مینار کے پاس کافی دیر کھڑا سوچتا رہا کہ ہماری بھی بے شمار ایسی حسرتیں ہوتی ہیں جو نا مکمل رہتی ہیں۔۔۔ایسی ہی حسرت ایک بادشاہ کی بھی تھی۔۔۔جو نا مکمل رہی۔

اگر آپ کو تاج محل جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھ سکتے ہیں تاج محل سفید سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں کالے سنگ مرمر کا ایسا ہی ایک اور تاج محل بنانا چاہتا تھا۔اس کی بنیادیں بھی کھودی گئیں، پتھر بھی ڈالا گیا لیکن وہ بھی مکمل نہ ہو سکا۔ میں نے وہ نا مکمل مینار آگرہ کے قلعے سے دیکھا ہے وہ دریائے جمنا کے پار دوسری طرف ہے۔
--

ابھی تک نا مکمل ہے۔۔۔شاید کسی شاہجہاں کا منتظر ہے جو اپنی بیوی کی خاطر اسے مکمل کر دے!!!

یہاں پر بے شمار اور عمارتیں موجود تھیں جنھیں دیکھتے دیکھتے خاصہ وقت گزر گیا۔آج میرے ساتھ رنبیر سنگھ مانگٹ بھی نہیں تھے اس لیے میں نے آج اکیلے ہی سیاحت کی اور پھر وہاں سے نکل آیا۔ مینار سے دور آکر میں رکا اور ایک دفعہ پھر مینار کو دیکھا اور کتنی ہی دیر دیکھتا رہا۔ جب آپ مینار کے پاس ہوتے ہیں تو آپ جتنا مرضی سر اٹھا لیں آپ مینار کی آخری منزل نہیں دیکھ پاتے لیکن اگر آپ دور سے دیکھیں تو آپ مکمل مینار دیکھ سکتے ہیں۔ جس سے آپ کو اس کے حسن کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

اگر آپ نے اس کی اونچائی کااندازہ لگانا ہو تو آپ اس طرح سے کر سکتے ہیں کہ مینار پاکستان لاہور کی اونچائی تقریباً 230 فٹ جبکہ قطب مینار کی اونچائی 240 فٹ ہے۔ بادشاہوں کے بنائے ہوئے مینار کو دیکھ کر اب میں اپنی اگلی منزل کی طرف چل دیا ۔ مینار کے متعلق ایک دلچسپ بات مشتاق یوسفی نے لکھی وہ کچھ یوں ہے "انسان اور پہاڑ میں فرق یہ ہے کہ پہاڑ دور سے چھوٹا اور قریب بڑا لگتا ہے جب کہ انسان دور سے بڑا اور قریب سے چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔"

حوض خاص: دہلی میں ایک خاص مقام

اگر آپ نئ دہلی سے قطب مینار کی طرف جائیں تو پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر حوض خاص کاعلاقہ ہے۔اسے حوض خاص گاؤں بھی کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں حوض پانی کے ایک چھوٹے تالاب کو کہا جاتا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ علاؤالدین خلجی کے دور میں منگولوں کا مقابلہ کرنے کے لیےاس علاقے میں ایک قلعہ بنایا گیا تھا جس کا نام سری ہے۔اس قلعے کو پانی مہیا کرنے کے لیے ایک تالاب بنایا گیا تھا جس کا نام حوض خاص رکھا گیا تھا۔ یہ علاقہ نئ دہلی کے جنوب میں واقع ہے جو کہ اب دہلی کا ایک بہت ہی پوش ایریا ہے۔اسی علاقے میں گریٹر کیلاش کے نام سے بہت ہی اعلی پائے کی ایک رہائشی کالونی بھی بنائی گئ ہے۔

میں جب بھی نئ دہلی سے قطب مینار کی طرف جاتا تو یہ علاقہ میرے راستے میں پڑتا تھا۔ خواہش کے باوجود میں اسے تفصیل سے نہ دیکھ سکا۔ یہ علاقہ بھی خاصا وسیع ہے اوراسے دیکھنے کے لیے وقت بھی کافی درکار تھا۔ البتہ کچھ چیزیں فاصلے سے دیکھنے کا ضرور موقع ملا جن کا مختصر تذکرہ پیشِ خدمت ہے۔

حوض خاص دہلی کا یہ سب سے وسیع اور سر سبز علاقہ ہے جس کے درمیان ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ اس علاقے کا رقبہ تقریباً ایک سو تیس ایکڑ ہے جہاں پر حکومت دہلی نے ہرنوں کے لیے ایک پارک بھی بنایا ہوا ہے۔ جِس میں ہرنوں کے ساتھ ساتھ بے شمار پرندے بھی موجود ہیں۔ دہلی کا یہ وہ مقام ہے جہاں سب سے زیادہ سبزہ پایا جاتا ہے۔ جھیل کے ارد گرد پرانے درختوں کی طویل قطاریں بھی موجود ہیں۔ یہاں آ کر آپ کو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ آپ ایک مصروف شہر میں موجود ہیں۔

اس علاقے کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ وہ علاقہ ہے جو خالصتاً ترکوں نے آباد کیا۔ جب میں اس کے قریب سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ بے شمار لوگ خاص طور پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک بڑے تالاب کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ ایک دفعہ میں یہاں سے گزر رہا تھا اور میرے پاس کچھ وقت بھی تھا، ایسی صورت میں مرکزی تالاب کے پاس کچھ وقت گزارنا اچھا لگ رہا تھا۔ لہٰذا میں تالاب کے پاس جا کر ایک جگہ گھنے درخت کے نیچے کچھ دیر کھڑا رہا۔

ذرا تصور کیجئے کہ آپ کے سامنے ایک وسیع و عریض تالاب ہو جو صدیوں پہلے ترک حکمرانوں نے بنایا ہو، اس کے ارد گرد انتہائی اونچے اور قدیم درخت ہوں، بیسیوں قسم کے پرندے چہچہا رہے ہوں، دنیا و جہان سے بے فکر نوجوان جوڑے ارد گرد تشریف فرما ہوں اور سب سے بڑھ کر انتہائی پر سکون ماحول۔۔۔

ایسے منظر کو بھول جانا ممکن نہیں ہوتا! اس منظر کو میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکا۔

ایسے منظر کی ایک جھلک مال روڈ سے کینٹ کی طرف جاتے ہوئے آپ کو نظر آتی ہے۔ جلو پارک بھی ایک سر سبز جگہ ہے لیکن حوض خاص اس سے کہیں زیادہ سر سبز ہے۔ حوض خاص کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اُن سات شہروں میں سے ایک ہے

جنھیں ملا کر دلی شہر بسایا گیا تھا۔ باقی شہروں میں گڑگاؤں، فریدآباد، غازی آباد وغیرہ شامل ہیں .وائی ڈی شرما نے دہلی اوراس کے مضافات کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جسے آرکیالوجی سروے آف انڈیا نے چھاپا ہے۔ اس میں باب نمبر چودہ میں حوض خاص کے متعلق تفصیل سے لکھا ہوا ہے[16]۔



Hauz Khas Delhi

ہندوستان میں مختلف مقامات کو دیکھنے کے بعد میرا یہ احساس مزید پختہ ہوا ہے کہ وسطی ایشیاء سے آنے والے حکمرانوں کے اندر خوشنما ماحول اور عالیشان عمارتیں بنانے

[16] Y.D.Sharma (2001). *Delhi and its Neighbourhood*. *Hauz Khas*. New Delhi: Archaeological Survey of India. pp. 79–81. Archived from the original on 31 August 2005. Retrieved 24 April 2009.

کا بے حد شوق تھا اور ان کو اس کا سلیقہ بھی آتا تھا۔ اسی لیے انھوں نے جو بھی چیزیں بنائی وہ صدیوں سے قائم ہے اور اب بھی اُن کا حسن لوگوں کے دلوں کو بے حد بھاتا ہے۔

اس علاقے میں ایک بہت ہی دلچسپ جگہ ہے جس کا نام چور مینار ہے۔ میرے علم کے مطابق ایسا مینار دنیا میں اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہ اینٹوں اور پتھر سے بنا ہوا ایک مینار ہے۔ اس کی اونچائی بھی تیس فٹ کے قریب ہو گی جبکہ چوڑائی بھی زیادہ نہیں ہے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب خلجی بادشاہ کسی کو موت کی سزا دیتا تھا تو اس کا سر کاٹ کر یہاں لٹکا دیا جاتا تھا۔ ابتداء میں یہاں چوروں کو سزا دی جاتی تھی۔ بعدازاں اس نے اپنے دشمنوں جن میں منگول بھی شامل تھے کو ایسی ہی سزا دینا شروع کر دی۔

میرا جی تو چاہتا ہے کہ میں ایسی باتیں نہ لکھوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور سب ہی لوگ اسے جانتے ہیں۔ سزا دینا یا نا دینا ایک فیصلے کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن سر کاٹ کر لٹکانا ہر لحاظ سے قابل مذمت ہے۔ یہ سب کچھ ایک مسلمان بادشاہ نے کیا۔ ایسے کاموں سے غیر مسلم کیا تاثر لیتے ہوں گے؟ میں نے ایک ہندو کو یہ بھی کہتے سنا کہ یہ کیسے مسلمان تھے؟ میں نے اس سے کہا کہ اسلام میں ایسے کسی فعل کی کوئی اجازت نہیں ہے، یہ ان مسلمان بادشاہوں کا ذاتی فعل تھا جو یقیناً اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا۔

یہ مینار اب بھی موجود ہے اور ہمارے مسلمان بادشاہوں کے ایک ناپسندیدہ فعل کی گواہی دے رہا ہے۔ اب حال یہ ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے ایسے ناپسندیدہ کاموں کی سزا ہندو طاقت میں آنے کے بعد دہلی میں رہنے والے غریب مسلمانوں کو دے رہا ہے۔ فروری 2020ء میں دہلی میں مسلمانوں پر ظلم کی آخیر کی گئی جس کی مثال ملنا ناممکن ہے۔ یہ سب مسلمان بادشاہوں کے اسی طرح کے اقدامات کا نتیجہ ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔ ممکن ہے آپ کے نزدیک کوئی اور وجہ ہو۔

اس علاقے میں ایک نیلی مسجد بھی موجود ہے جس پر لگی ہوئی تختی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد سولہویں صدی کے آغاز میں بنائی گئی تھی۔ اس وقت دہلی میں لودھی خاندان کی حکومت تھی۔ میں وہ مسجد تو نہ دیکھ سکا البتہ تصاویر ضرور دیکھی ہیں۔ تصاویر سے لگتا تھا کہ یہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے لیکن نہایت ہی دیدہ زیب ہے۔ جس علاقے میں یہ مسجد ہے وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ نہیں ہے،اس لیے اس مسجد میں صرف جمعہ کی نماز ہی پڑھی جاتی ہے۔

سرگنگارام ہسپتال لاہور اور سرگنگارام ہسپتال دہلی

میں جب پرانی دلی سے جنتر منتر کی طرف جا رہا تھا تو میں نے اپنے دائیں طرف سرگنگارام ہسپتال کا بورڈ دیکھا۔ سرگنگارام کا نام پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی، اس کی وجہ سرگنگارام کی لاہور کے لیے انمٹ خدمات ہیں۔ سرگنگارام وہ شخصیت ہیں جنھیں میں خدمت اور تعمیراتی کارناموں کی وجہ سے اپنے ہیروز میں سے سمجھتا ہوں۔ان کا ایک مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔

سرگنگارام اگروال 1851ء میں مانگٹانوالا تحصیل جڑانوالہ میں ایک پولیس آفیسر کے گھر پیدا ہوئے۔آپ کی ابتدائی تعلیم امرتسر میں ہوئی۔ بعد میں آپ نے سول انجینئرنگ میں گریجویشن کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ انگریز سرکار کے ساتھ بطورِ سول انجینئر کام کرنے لگے۔اس دوران انھوں نے ساہیوال میں حکومت سے پچاس ہزار ایکڑ اراضی حاصل کی اور صرف تین سال کی محنت سے اسے زرخیز زمین میں بدل دیا۔

آپ نے 1921ء میں اندرون لاہور گنگارام ہسپتال قائم کیا۔ موجودہ گنگا رام لاہور اسپتال کی جگہ بھی انھوں نے اپنی زندگی میں خرید کر وقف کر دی تھی۔ سرگنگا

رام کی وفات 1927ء میں ہو گئی۔ ان کی وفات کے بعد 1943ء میں ان کے خاندان نے موجودہ گنگارام ہسپتال کی تعمیر کی۔ 1944ء میں سر گنگارام کے بیٹے بلک رام کے نام سے ایک میڈیکل کالج بھی بنایا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد یہ کالج بند کر دیا گیا اور بعد میں یہاں پر فاطمہ جناح میڈیکل کالج برائے خواتین بنایا گیا۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج بنانے کے لیے بلک رام اگروال میڈیکل کالج کی عمارت ہی استعمال میں لائی گئی۔

اس کا پرانا نام کیوں تبدیل کر دیا گیا؟۔۔۔اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ وہی بتا سکتے ہیں جنھوں نے تبدیل کیا۔۔۔

تقسیم ہند کے بعد گنگا رام کا خاندان بھارت نقل مکانی کر گیا۔ سر گنگا رام کی اولاد نے دہلی میں بھی ایک گنگا رام اسپتال بنایا۔ اس طرح سے ایک شخص کا لگایا ہوا یہ پودا جسے آج ایک سو سال ہو چکا ہے، اس سے آج بھی لوگوں کی ایک کثیر تعداد مستفید ہو رہی ہے۔

یہ سب دیکھ کر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو بھی چیز اللہ کے بندوں کی بھلائی کے لیے بنائی جاتی ہے وہ تا دیر قائم رہتی ہے۔گنگارام ٹرسٹ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔

سر گنگارام نے لاہور میں بہت سی عمارتوں کی ڈیزائننگ بھی کی اور ان کی تعمیر بھی ان ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ جنرل پوسٹ آفس، لاہور میوزیم، ایچی سن کالج، میو ہسپتال کا ایک وارڈ، ماڈل ٹاؤن، نیشنل کالج آف آرٹس، رینالہ خورد کے اندر ہائیڈرو پاور پلانٹ ان میں سے چند ایک ہیں۔ ان کی بیش بہا خدمات کی وجہ سے حکومت برطانیہ نے ان کو سر، رائے بہادر اور نائٹ کا خطاب دیا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بہت زیادہ دولت کمائی اور اپنی زندگی میں ہی اسے لوگوں کی بھلائی کے لیے خرچ کر دیا۔

ہیلی کالج کا قیام بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ پنجاب میں ایک کامرس کالج ہونا چاہیے۔ اس کے لیے انھوں نے انگریز گورنر سے بات کی۔ اس نے کہا کہ جگہ نہیں ہے۔ جس پر سر گنگارام نے اپنی کوٹھی دے دی۔ جس میں ہیلی کالج قائم کیا گیا۔ اس کالج کے افتتاح کے موقع پر کئ گئ تقریر ہیلی کالج آف کامرس کی ویب سائٹ پر اب بھی موجود ہے[17]۔ میں نے اس تقریر کو پڑھا ہے۔ یہ تقریر ایک شاہکار معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اسے پڑھا ہے۔ یہ ایک متاثر کن تقریر ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اب بھی دہلی میں سر گنگارام ٹرسٹ کی طرف سے لاہور میں واقع سر گنگارام ہسپتال کی مالی امداد بھی کی جاتی ہے۔ وقت کی قلّت کی وجہ سے میں یہ ہسپتال نہ دیکھ سکا، جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ اس کے ساتھ میں نے دیکھا کہ وہاں مادام تساؤ کا میوزیم بھی موجود تھا۔ اس وقت تک میں نے لندن میں مادام تساؤ کا میوزیم نہیں دیکھا تھا۔ بعد ازاں مجھے 2008ء میں لندن میں یہ میوزیم دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ بہر حال اس وقت میری منزل جنتر منتر تھی۔

[17] http://hcc.edu.pk/page.php?name=the+founder



Sir Ganga Ram Hospital Dehli Photo Credit:
https://www.thequint.com

جنتر منتر : ستاروں کی گردش جاننے والا تین صدیاں قبل ایک مرکز

جنتر منتر دونوں ہندی کے لفظ ہیں۔ عام طور پر بچوں کو بہلانے والے جادو گر ایسے الفاظ بولتے ہیں۔ میرے لیے وہ جگہ جہاں پر علم و ہنر سے متعلقہ چیزیں پائی جائیں نہایت ہی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ جب میں نے جنتر منتر کے بارے میں پڑھا تو مجھے حیرانی ہوئی کہ کیسے تین صدیاں قبل جے پور کے مہاراجہ جے سنگھ نے پانچ مختلف شہروں میں اس طرح کی عمارتیں بنوائیں۔ یہاں پر سورج اور ستاروں کی گردش دیکھی جاتی تھی اور اس کے مطابق کیلنڈر بنایا جاتا تھا۔ اس کام کے لیے مہاراجہ جے سنگھ نے ہندو اور مسلمان ماہرین پر مشتمل ایک ٹیم تشکیل دی جنھوں اس طرز کی عمارتیں بنائیں جن کے سائے سے تاریخ اور وقت معلوم کیا جاتا تھا۔ میں نے ایسا ہی ایک سن ڈائل چین میں بھی دیکھا تھا۔ ایک ٹیڑھی رکھی ہوئی بڑی پلیٹ کے اوپر لوہے کا ایک راڈ لگا ہوا تھا۔ جیسے جیسے سایہ اپنی جگہ بدلتا ویسے ویسے ہی اس ڈائل پر لکھے ہوئے نمبروں سے وقت کا پتا چل جاتا تھا۔

دہلی کی یہ عمارت 1724ء میں بنائی گئی تھی۔ اس وقت نظام الملک آصف جاہ مغل بادشاہ تھا۔ اس عمارت کو جنگ آزادی میں کافی نقصان پہنچا لیکن اچھی حالت میں ہونے کی وجہ سے اب یہ ایک پکنک پوائنٹ بن گیا ہے۔ میرے لیے سب سے بڑی حیرانی یہ تھی کہ کس طریقے سے انھوں نے یہ سن ڈائل بنایا جس کی اونچائی 70 فٹ اور لمبائی 114 فٹ ہے۔ وہ لوگ اس کی مدد سے بہت ساری معلومات حاصل کرتے تھے۔

آپ کو یہ جان کر بھی خوشی ہوگی کہ دنیا کے ایک بہت بڑے سائنس دان سٹیفن ہاکنگ نے 2001ء میں اپنے دورہ بھارت کے موقع پر یہ عمارت بھی دیکھی تھی اور وہ اس عمارت سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھنے کے بعد اس نے یہ کہا تھا کہ قدیم زمانوں سے ہی اہلِ ہند ستاروں کے حساب کتاب میں سب سے آگے رہے ہیں ۔ جنتر منتر میں چار بڑی عمارتیں ہیں جن سے بہت سی معلومات حاصل کی جاتی تھیں۔ اس طرح کی چار مزید عمارتیں جے پور، متھرا، بنارس اور اوجین میں بھی بنائی گئیں تھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اُسی وقت ممکن ہوا ہو گا جب مہاراجہ اور مغل حکمرانوں نے مشترکہ طور پر کوشش کی ہوگی۔ یہ اس زمانے کی ایک بہت بڑی ایجاد تھی۔ اب تو خیر ٹیلی سکوپ کے ذریعے سب کچھ دیکھا جاسکتا ہے، اس وقت صرف سائے کی گردش ہی سے ستاروں کی چال معلوم کی جاتی تھی۔ جنتر منتر پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جو ان لوگوں کے لیے بے حد دلچسپ ہیں جو فلکیات کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میری دلچسپی ان لوگوں کو شاباش دینے تک تھی جنھوں نے تین صدیاں قبل یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ جنتر منتر کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بیری پرلس نے اپنی کتاب

Celestial Mirror: The Astronomical Observatories of Jai Singh

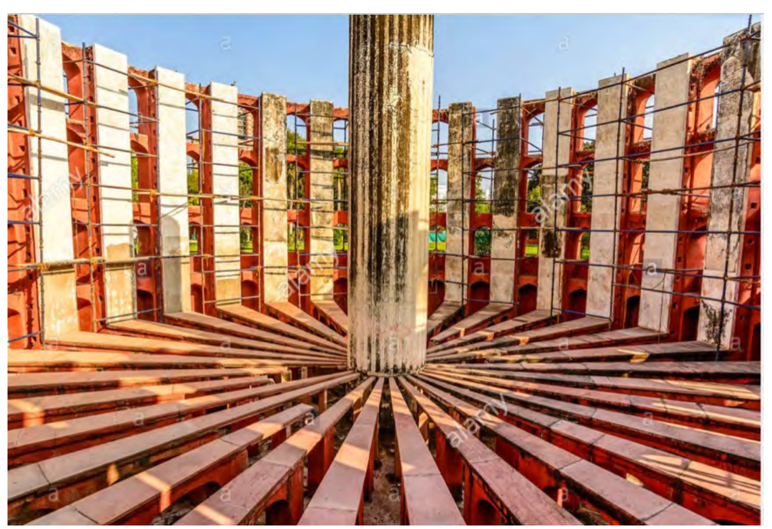
میں لکھا ہے۔ جس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کہ یہ تجربہ گاہ کس پائے کی ہے[18]۔

میں ان عمارتوں کے پاس بہت دیر تک کھڑا وہاں پر لگی تختیاں بھی پڑھتا رہا۔ جس پر اس جگہ کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ آپ شاید میری اس بات سے اتفاق نہ کریں کہ اہل ہند سائنس میں کبھی بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے اس بات کا اظہار ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی مختلف عمارتوں سے ہوتا ہے لیکن دنیا میں ہمارا ایہی تاثر ہے کہ جب یورپ میں یونیورسٹیز بن رہی تھیں تو ہم محلات بنا رہے تھے۔ یہ بات درست ہے لیکن محلات بنانے کے لیے بھی سائنس کا علم ہونا بے حد ضروری تھا۔

آپ میری اس بات پر ضرور اتفاق کریں گے کہ اہل یورپ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے علم کو عام لوگوں تک پہنچایا جبکہ اہل ہند نے یہ علم لوگوں تک پہنچانے کے لیے ادارے قائم کرنے میں غفلت برتی۔ ایک اور بات جو عام طور پر کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور میں ہندوستان میں کوئی سائنسی ترقی نہیں کی۔ یاد رہے مسلمان کبھی بھی پورے ہندوستان کے حکمران نہیں رہے۔ بہت سے علاقوں کے حکمران مقامی لوگ ہی تھے۔ خاص طور پر جنوبی ہندوستان میں مسلمانوں کا عمل دخل بہت کم رہا ہے۔اس لیے صرف یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے سائنس پر توجہ نہیں دی البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اہل ہند کو سائنس کے علم کو لوگوں تک پہنچانے میں جو خاطر خواہ کوشش کرنی چاہیے تھی، وہ انھوں نے نہیں کی۔

ایسا نہ کرنے کی سزا اب تک اہلِ ہند بھگت رہے ہیں۔۔۔ کاش ! تاج محل کے ساتھ تاج یونیورسٹی بھی ہوتی تو بے حد خوبصورت لگتی ! ! !

Celestial Mirror: The Astronomical Observatories of Jai Singh II–Illustrated, July 2, 2020
by Barry Perlus (Author) [18]



Jantar Mantar Dehli, Photo Credit:
https://www.alamy.com

تین مورتی: انگریز فوج کے سربراہ کی رہائش گاہ

جب انگریزوں نے نئی دہلی کو آباد کیا تو انھوں نے وائسرائے کی رہائش گاہ کے ساتھ ساتھ برطانوی آرمی چیف کی رہائش گاہ بنانے کا بھی فیصلہ کیا اس مقصد کے لیے ایک بڑی عمارت بنائی گئی۔اس عمارت کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس کے مرکزی دروازے پر تین سپاہیوں کے مجسمے بنائے گئے ہیں۔ بظاہر تو یہ کوئی اہم بات نہیں تھی لیکن جب میں نے اس کی تاریخ پڑھنے کی کوشش کی تو بہت ہی دلچسپ بات معلوم ہوئی۔

جیسا کہ میں نے پچھلے صفحات میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ دنیا میں جہاں بھی انگریزوں کی لڑائی ہوتی تھی اس کے لیے برطانوی فوج میں ہندوستان بھر سے بھرتی کیے ہوئے لوگ جاتے تھے۔ 1918ء میں حیفہ نام کا ایک شہر فلسطین میں تھا جو ترکوں کے قبضہ میں تھا اور یہ سلطنت عثمانیہ کا ایک اہم حصہ تھا، اب یہ اسرائیل کا تیسرا بڑا شہر

ہے اور سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے بہت اہمیت کا حامل بھی ہے۔ اس شہر پر قبضے کے لیے انگریزوں اور ترکوں کی آپس میں ایک سخت لڑائی ہوئی، جس میں ہندوستان کے تین علاقوں جودھپور، میسور اور حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے مسلمان، ہندو اور سکھ سپاہیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس جنگ میں 44 ہندوستانی سپاہی اپنی جان کی بازی ہار گئے۔ مرنے والوں میں مسلمان، ہندو اور سکھ تینوں شامل تھے۔ ان تینوں علاقوں کے فوجیوں کی یاد میں یہاں پر تین مورتیاں بنائی گئیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انگریز اپنے جانثاروں کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف کے گھر کے باہر تین فوجیوں کی مورتیوں کی وجہ سے اس عمارت کو تین مورتی کہتے ہیں اور اس چوراہے کا نام بھی تین مورتی چوک ہی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ کہ اُس وقت ایک طرف تو ہندوستانی مسلمان خلافت عثمانیہ کے بچاؤ کے لیے تحریک چلا رہے تھے، مسلمان خواتین اپنے زیور تک ترکی بجھوا رہی تھیں اور دوسری طرف انگریزوں کے تنخواہ یافتہ ہندوستانی سپاہی جن میں مسلمان بھی شامل تھے، ترکوں کے ساتھ جنگ کر رہے تھے۔ اُن کی خدمات کے صلہ میں انگریز اُن کی مورتیاں بنا کر اپنے گھروں کے سامنے رکھ رہے تھے۔

ہم کس طرف تھے؟ آپ خود ہی فیصلہ کریں تو بہتر ہو گا۔

یہ بات بھی کافی اہمیت کی حامل ہے کہ بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو 16 سال تک اس عمارت میں رہائش پذیر رہے اور اسی عمارت میں انکی وفات بھی ہوئی۔ ان کی وفات کے بعد یہاں پر جواہر لال نہرو انسٹیٹیوٹ اور لائبریری کے علاوہ اس طرح کی بہت ساری چیزیں بنائی گئیں ہیں۔ اس وقت یہ کسی کی رہائش گاہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑا کمپلیکس ہے۔

میں جب اس کے اندر گیا تو دیکھا کہ یہ بہت ہی عالی شان عمارت ہے۔ آدمی اس کی شان و شوکت کو دیکھ کر ہی دنگ رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ میں عمارت کی نسبت اس سے جڑی ہوئی کہانی میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں۔ مجھے خیال آیا کہ فوج کا حکومت میں عمل دخل کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کی بنیاد صدیوں پہلے ہندوستان میں رکھ دی گئی تھی۔ یہ عمارت کسی بھی لحاظ سے وائسرائے کی رہائش سے کم نہیں ہے اور اس کا رقبہ بھی تیس ایکڑ سے زائد ہے۔

اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سپہ سالار اس وقت بھی کم اہم نہیں تھا اور اب بھی نہیں ہے!

ایک اور اہم بات یہ کہ 2018ء میں جب اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو بھارت آئے تو انھوں نے اس چوک کا نام تین مورتی حیفہ رکھنے کی فرمائش کی جو بھارتی حکومت نے مان لی۔ اب اس چوک کا نام تین مورتی حیفہ رکھ دیا گیا ہے۔ جب نریندر مودی اسرائیل گیا تو وہ حیفہ بھی گیا جہاں پر ہندوستانی فوجیوں کی قبریں ہیں۔ کچھ حلقوں سے اس کی مخالفت بھی ہوئی لیکن بالآخر اسرئیل جیت گیا اور اس علاقے کا نام تین مورتی حیفہ رکھ دیا گیا ہے جو ہمیں یاد دلاتا رہے گا کہ سلطنت عثمانیہ کی تباہی میں ہم ہندوستانی لوگوں کا بھی ایک اہم کردار ہے۔

انگریزوں اور ترکوں کی لڑائی میں ہندوستانی لوگ مارے گئے۔ اب بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ روس اور امریکہ کی جنگ میں افغان تباہ ہو گیا اور افغان مسلمان ان گنت تعداد میں مارے گئے۔۔۔

ہاتھیوں کی لڑائی میں نقصان تو گھاس ہی کا ہوتا ہے۔۔۔ اور وہ آج بھی ہو رہا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ نئی نسل کی ذہنی تشکیل کرتا ہے تو اس میں یہ بات اہم کردار ادا کرتی ہے۔

تاریخ سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس علاقے میں خوشک نام کا ایک گاؤں آباد تھا جس میں جاٹ لوگ رہتے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے اپنے دور حکومت میں یہاں ایک شکارگاہ تیار کروائی تھی۔اس شکارگاہ کی باقیات اب بھی موجود ہیں لیکن میں انھیں دیکھ نہ سکا۔ 1922ء میں اس گاؤں کو ختم کرکے تیس ایکڑ پر فوج کے سربراہ کا گھر بنا دیا گیا۔ میں بہت دیر تک وہاں پہ رکا رہا۔ ایک طرف فوج کے سربراہ کا گھر تو دوسری طرف پارلیمنٹ کی پر شکوہ عمارت اور تیسری طرف صدر کا محل نظر آرہا تھا۔

یہ سب طاقت کے مراکز تھے۔۔۔ اور جو میں نے پچھلے دنوں میں دہلی کے پسماندہ علاقے دیکھے تھے وہاں رہنے والوں کے کندھے ان کی طاقت کا سرچشمہ تھے۔۔

ایک اچھی بات یہ ہے کہ نہرو کی موت کے بعد اب یہ وزیراعظم کا گھر نہیں ہے بلکہ ایک کمپلیکس ہے۔ یہاں آنے والے لوگوں کو ہندوستان کی آزادی کی تاریخ بتائی جاتی ہے اور اب یہ تین مورتی حیفہ چوک ہے جو بھارت اور اسرائیل کی گہری دوستی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ تین مورتی بارے ہندوستان ٹائمز نے ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ جس میں اس عمارت کے بارے میں کافی دلچسپ معلومات دی ہوئیں ہیں۔[19]

19 https://web.archive.org/web/20141102085932/http://www.hindustantimes.com/News-Feed/newdelhi/Architectural-marvels-for-the-new-capital/Article1-723169.aspx



Teen Morti, Visit of Israel Prime Minister and Complex,
Photo Credit: https://www.indiatoday.in

کناٹ پلیس: نئی دہلی کا تجارتی مرکز

انگریزوں نے جب نیو دہلی آباد کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے پارلیمنٹ ہاؤس، وائسرائے کی رہائش گاہ اور بہت سی دوسری عمارتوں کے ساتھ بہت ایک بڑی مارکیٹ بھی بنانے کا بھی فیصلہ کیا۔ جس کے لیے انگریزوں کو کئی گاؤں ختم کرنے پڑے۔ ایسا تو ہمیشہ سے ہی ہوتا آیا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے تیسرے بیٹے پرنس آرتھر ،جو ڈیوک آف کناٹ ہونے کے ساتھ ساتھ کینیڈا میں گورنر جنرل بھی تھے، نے ہندوستان کے دورے کے موقع پر 1921ء میں کناٹ پلیس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس مارکیٹ کی تعمیر 1929ء میں شروع ہوئی اور 1933ء میں مکمل ہوئی۔ یاد رہے کہ کناٹ آئرلینڈ کا ایک صوبہ بھی ہے۔

کناٹ پلیس میں مارکیٹ ایک گول شکل میں ہے۔ یہ بہت ہی مصروف علاقہ ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بھارت کے اندر سب سے بڑی کمرشل مارکیٹ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دنیا کی دس بڑی مہنگی جگہوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ یہاں پر پالیکا بازار کے نام سے ایک زیر زمین مارکیٹ بھی ہے۔

اس کی تعمیر کی تفصیل میں جانا تو مناسب نہیں ہے لیکن ایک بات بہت واضح ہے کہ انگریزوں نے نئی دہلی میں عمارتیں بناتے وقت ہندوستانی طرز تعمیر کا خاص خیال رکھا ہے لیکن کناٹ پلیس کو انھوں نے بالکل اپنے برطانوی طرز پر بنایا ہے۔ اُسی طرز کے برآمدے اور گول ستون ہیں۔ مجھے اس مارکیٹ میں مال روڈ لاہور پر بنی ہوئی پرانی مارکیٹوں میں بے حد مشابہت محسوس ہوتی ہے۔ لاہور کا مال روڈ اور دہلی کی کناٹ پلیس ایک ہی دور میں بنائی گئیں ہیں جس کی وجہ سے ان کا طرز تعمیر بھی ایک ہی جیسا ہے۔

میں نے مارکیٹ کے پاس گردوارہ بنگلہ صاحب، ہندو مندر اور اس سے ملحقہ ایک پارک جہاں بھارت کا ایک بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا بھی دیکھا۔ مجھے ان تینوں چیزوں کی موجودگی سے احساس ہوا کہ یہ لوگ ایسے کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جہاں پر اپنا دھرم اور وطنیت ظاہر نہ کریں۔ لاہور کی لبرٹی مارکیٹ بھی ایک سیمی سرکل میں ہے۔ اس سے پہلے گلبرگ لاہور میں مین مارکیٹ بھی ایک سیمی سرکل کی شکل ہی میں بنائی گئی تھی۔ کیا ہم نے کناٹ پلیس سے متاثر ہو کر لبرٹی اور مین مارکیٹ اُسی طرز پر بنائی ہیں یا محض اتفاق ہے؟ معلوم نہیں!

میری سب سے زیادہ دلچسپی انڈر گراونڈ مارکیٹ میں تھی۔ میں بڑی دیر تک لوگوں کو دیکھتا رہا۔ بے شمار لوگ خریداری کر رہے تھے لیکن اُن جگہوں پر سب سے زیادہ رش تھا جہاں چٹ پٹے کھانوں کی دکانیں تھیں۔ مجھے ایک نہایت ہی انوکھا پان دیکھنے کو ملا، جسے فائر پان کہتے ہیں۔ اِسے منہ میں ڈالنے سے پہلے آگ لگاتے تھے اور پان منہ میں جاتے ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے!

اس مارکیٹ کے بارے میں ہندوستان ٹائمز میں Avishek G Dastidar نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں اس مارکیٹ کی ایک دلچسپ تاریخ دی ہوئی ہے[20]۔ ایک اور مضموں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ کبھی یہاں پر ایک ایسا گاؤں بھی تھا جس کا نام راجہ کا بازار تھا۔ اب اس گاؤں کا علاقہ کناٹ پیلس میں شامل ہے۔

راجہ اور وائسرائے میں نام کے علاوہ کوئی اور فرق نہیں ہے۔ دونوں کا کام حکمرانی کرنا ہے۔

ایسی جگہوں پر میری سب سے بڑی خواہش کسی کونے میں بیٹھ کر چائے یا کافی پینے کی ہوتی ہے۔ میں انڈر گراونڈ مارکیٹ کی چھت پر ایک درخت کے نیچے لگی کرسی میز پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ اس وقت میرے ذہن میں اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انگریزوں نے یہ سب کچھ کتنی ترتیب اور خوبصورتی سے بنایا ہے جس میں سو سال بعد بھی کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کیسے ممکن ہوا اور اُن کے پاس وہ کونسا خاص ہنر تھا جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ باالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غیر ملکی حکمران (جن میں ترک، افغان اور انگریز بھی تھے) چند ہزار کی تعداد میں آئے اور یہاں لاکھوں لوگوں پر انھوں نے ساڑھے سات سو سال تک حکومت کی۔ یاد رہے کہ 1206ء میں قطب الدین ایبک مسلمانوں کا پہلا بادشاہ بنا تھا اور 1947، یعنی 741 سال اس شہر پر غیر ملکی حکمرانوں کی حکومت رہی۔ ان غیر ملکیوں کی حکمرانی کی وجہ ان کی تعداد نہیں بلکہ وہ فنِ حکمرانی تھا جو ان کے پاس تھا اور ہمارے پاس نہیں۔

یہ بات شاید آپ کو مناسب نہ لگے لیکن مجھے آج بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب بھی غیر ملکی ہم پر بلواسطہ حکمرانی کر رہے ہیں۔ اب ان کا نام وائسرائے لارڈ ماؤنٹ

[20]https://web.archive.org/web/20141102085932/http://www.hindustantimes.com/News-Feed/newdelhi/Architectural-marvels-for-the-new-capital/Article1-723169.aspx

بیٹن نہیں ، بلکہ آئی یم ایف اور ورلڈ بنک، یو این او کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی طرح کے نام ہیں۔ ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے وہی فنِ حکمرانی حاصل کرنا ہوگا تب جا کر ہم ایک آزاد قوم کہلوانے کے حق دار ہو نگے۔ اس سلسلے میں بھارت اور پاکستان کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس دوران میری چائے بھی ختم ہو گئی اور ٹیکسی ڈرائیور نے بھی اپنی گھڑی دکھا کر کہا کہ گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔۔۔ اس کی پتنی اس کا انتظار کر رہی ہے۔۔۔

نئی نئی شادی کے بعد شادی شدہ جوڑے کا خیال تو کرنا چاہیے۔

الوداع دہلی

آج دہلی میں میرا آخری دن تھا اور میں نے حسب معمول یہ دن گھر والوں کے لیے خریداری کا رکھا تھا۔ کچھ لوگوں سے مشورہ کیا تو انھوں نے بتایا کہ آپ کے لیے لالہ لاجپت رائے مارکیٹ بہت مناسب ہے۔ میں وہاں پر چلا گیا اور مجھے ایک ساڑھی پسند آ گئی جو دکاندار نے پلاسٹک کے مجسمے کو پہنا رکھی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ آپ یہ ساڑھی مجھے دے دیں۔ یہ ایک عام سی بات تھی لیکن اس موقع پر کچھ ایسا ہوا کہ جس نے اس خریداری کو بہت ہی خاص کر دیا جو شاید میں کبھی بھی بھول نہ سکوں۔

دوکاندار ایک نوجوان تھا، اس نے پلاسٹک کے مجسمے سے وہ ساڑھی اتارنے سے پہلے اس پر ایک کپڑا ڈالا پھر نیچے سے ہاتھ ڈال کر ساڑھی کو نکالا۔ میں یہ سب دیکھتا رہا۔ میری حیرانی کو بھانپ کر دکاندار نے کہا میں نہیں چاہتا کہ خاتون کے پلاسٹک کے مجسمے کو کوئی برہنہ دیکھے۔ مجھے یہ بہت ہی اچھا لگا۔ پاکستان آ کر میں نے یہ ساڑھی اپنی اہلیہ محترمہ کو پیش کی۔ وہی جواب ملا جو پہلے بھی ملتا رہا اور آج بھی مل رہا ہے جب تک زندگی ہے ایسا ہی جواب ملے گا۔

ان کا جواب تھا کہ آپ کو تو رنگوں کی پہچان نہیں ہے۔ ایسے بے شمار رنگ تو پہلے ہی سے میرے پاس ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ آپ کیا اٹھا لائے ہیں؟ کیا میں یہ پہن کر لوگوں سے ملوں گی؟ فلانی کا شوہر بھارت گیا تھا وہ اتنی خوبصورت ساڑھی لے کر آیا تھا۔ میں کیا بتاؤں گی اور اسی طرح کے بیسیوں اور تبصرے۔۔۔

لیکن کیا کریں کچھ تو لانا ہوتا ہے۔ یہ سب سن کر میں ایک ہی بات پوچھتا ہوں مجھے کیوں اور کیسے پسند کر لیا تھا؟ میرے میں کونسا رنگ تھا جو آپ کو پسند آ گیا تھا؟ جواب سوائے خاموشی کے کچھ نہیں ہوتا۔

میں کچھ لانے سے باز نہیں آتا اور ان کو ہماری لائی ہوئی کوئی چیز پسند نہیں آتی۔ زندگی کے 37 سال ایسے ہی گزر گئے اور باقی کے بھی اسی طرح سے گزرنے کی امید ہے۔

آپ کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے؟

یقیناً مختلف نہیں ہوگا۔۔۔ مجھے پوری امید ہے۔

میں ایک چادر اپنی ماں کے لیے لایا تھا جو انھوں نے تین مرتبہ چومی، پھر اپنے صندوق میں سنبھال کر رکھ لی، کہنے لگیں کہ میں اسے عید والے دن لوں گی، خوشی خوشی لوگوں کو بتاؤں گی کہ یہ کتنی خوبصورت ہے اور میرا بیٹا بھارت سے لایا تھا۔۔۔ یہ چادر میرے دیس سے آئی ہے، جہاں کی میری پیدائش ہے، جہاں میرا بچپن گزرا اور جو میرا پہلا وطن تھا۔ جسے ہم نے صرف دیس کے نام سے ہی یاد رکھا لیکن جسے ہمیں چھوڑنا پڑا، رات کی تاریکی میں، جہاں ہم نے سکھ بن کر، اپنا دھرم چھپا کر اور اپنے ہی گھر میں چھپ کر جان بچائی تھی۔

بس یہی فرق ہوتا ہے اپنی ماں میں اور بچوں کی ماں میں!

اگلے دن شرما جی مجھے ائیر پورٹ چھوڑنے آئے اور انھوں نے گاڑی دوبارہ اسی جگہ پارک کی جہاں پہلے دن کی تھی۔ سات روز میں کیا فرق پڑ سکتا تھا؟ خیریت سے گھر واپس پہنچنے پر اللہ رُب العزت کا بے حد شکر ادا کیا۔

پچیس سال پہلے کیے گئے سفر کی رُوداد آپ کی خدمت میں پیش کی اور اب اس کے بعد دوسرے سفر کی تفصیلات حصہ دوم میں آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔



تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال نے کئی خاندانوں کو اُنکے آبائی علاقوں سے ہجرت پر مجبور کر دیا اور اُنھی بدقسمت لوگوں میں ایک میرا خاندان بھی شامل تھا جو موجودہ بھارت کی ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند سے ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ سکونت پذیر ہوئے۔ میری پیدائش 15 مارچ 1958ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوئی۔ میں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور فیصل آباد میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے Textile کے شعبے کا انتخاب کیا اور 1981ء میں نیشنل کالج سے Textile Engineering کی ڈگری مکمل کی۔ اپنی مہارت کو مزید تقویت دینے کیلئے میں نے مختلف ملازمتوں سے تجربہ حاصل کیا اور 1992ء کے بعد سے اپنے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔ مسلسل سیکھنے کے اصول پر کارفرما رہتے ہوئے میں نے اپنے انتہائی مصروف اوقات میں سے وقت نکال کر 2001ء میں University of Management Technology سے MBA میں گولڈ میڈل بھی حاصل کر لیا۔

علم کا اشتیاق بڑھا تو 2008ء میں The University of Manchester سے MPhil اور 2012ء میں Czech Republic کی معروف یونیورسٹی سے Textile میں PhD بھی کر لی۔ کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ میں کئی فلاحی اداروں (غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ، الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان اور تعاون فاؤنڈیشن) سے بھی منسلک رہا اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔

اس کتاب کا مواد کئی مُستند تاریخی حوالوں سے حاصل کیا گیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ اُنھی حالات وواقعات کو بیان کیا جائے جن پر اجماع کثیر ہو لیکن پھر بھی اگر کسی تاریخ یا واقعے میں کوئی تضاد پایا جائے تو ہر حال میں اسکی اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔


ISBN 978-996-9522-54-1

اس کتاب سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے بچوں کی تعلیم وتربیت پر خرچ کی جائے گی۔ انشاءاللہ